ماہنامہ نمود لاہور



مدیر: قائم نقوی

Scanned with CamScanner



مظہر عباس
سعیدہ سلیم
نوید ریاض
قائم نقوی
ظہیر بدر
کاظم جعفری



کنول فیروز
اختر شمار
زاہد مسعود
خورشید رضوی
نجیب احمد
قاضی جاوید
اعجاز رضوی



محسن بھوپالی، انور زاھدی
ماہ طلعت زاھدی
اور ادیب سہیل

Scanned with CamScanner

ماہنامہ نمود لاہور

مدیر

قائم نقوی

☆☆☆☆

جلد نمبر 3 شمارہ نمبر 3,2,1

☆☆☆☆

جنوری، فروری، مارچ 2015

☆☆☆☆

فی شمارہ -/60روپے

بمہ ڈاک خرچ -/100روپے

بیرون ممالک -/10ڈالر

☆☆☆☆

زرِ سالانہ بمہ ڈاک خرچ -/600روپے

بیرون ممالک -/60ڈالر

☆☆☆☆

ٹیلی فون :042-35974195

03015253177:

03314822964:

ای میل

namood.qaimnaqvi@gmail.com

پتہ: 56۔ کوچہ سیف الملوک، سلیم سٹریٹ، چھپڑ سٹاپ، ملتان روڈ، لاہور

قائم نقوی نے نقوی برادرز پرنٹرز دربار مارکیٹ لاہور سے چھپوا کر چھپڑ سٹاپ ملتان روڈ سے شائع کیا۔

Scanned with CamScanner

فہرست

اداریہ ۳

نعت وسلام

فرخ راجا ۴

ناصر بشیر، ریاض ندیم نیازی ۵

ظہور احمد ظفر الحق چشتی ۶

مضامین

علامہ اقبال اور موسیقی — لطیف ساحل ۷

لیہ ایک علمی وادبی مرکز — ڈاکٹر مزمل حسین ۲۰

نظم 'ہم لوگ' کا تجزیہ — تنویر قاضی ۲۵

اصطلاح سازی کے بنیادی مباحث — ناصر بشیر ۲۷

انشائیے

کچھ محبت کے بارے میں — مشکور حسین یاد ۳۱

غزلیں ۳۳

روحی کنجاہی سلیم الرحمٰن ،ڈاکٹر آصف مغل، اسلم سحاب ہاشمی، ریاض ندیم نیازی، ظہور احمد، محمد علی ظاہر
ڈاکٹر نبیل احمد نبیل، ڈاکٹر لبنیٰ آصف، قائم نقوی

فن اور فنکار

کمل داس گپتا.....ایک بلند پایہ اور صاحب اسلوب موسیقار — سلیم الرحمٰن ۴۰

افسانہ

نمک — محمود احمد قاضی ۵۲

موسم — راشد جاوید احمد ۵۷

کرش انڈیا — مہر غلام فرید کاٹھیا ۶۰

تمغہ — علی اکبر ناطق ۶۴

نظمیں ۷۰

مشکور حسین یاد، منو بھائی،

Scanned with CamScanner

اداریہ

۲۰۱۳ء کو ڈیکلریشن کے حصول کے بعد "نمود" نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور اب "نمود" کو شائع ہوتے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ان دو برسوں میں "نمود" کا حلقۂ احباب وسیع ہوا ہے۔

'نمود' اپنے تئیں ادب و ثقافت کی ترویج و استحکام کے لئے کام کررہا ہے اور یہ کام آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔تمام ادب دوست احباب نے 'نمود' کے ساتھ بھرپور قلمی اور مالی تعاون کیا ہے جس کے لئے میں تمام احباب کا شکر گزار ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ۲۰۱۵ء میں بھی یہ تعاون جاری رہے گا۔آپ کے مزید مفید مشوروں کا انتظار ہے گا۔

قائم نقوی

Scanned with CamScanner

فرخ راجا

نعت

مدینہ شب زدوں کو صبح کا منظر دکھاتا ہے
یہ آئینہ جمالِ مصطفیٰؐ سے جگمگاتا ہے
کوئی جنت سے نکلے تو زمین مسکن بنے اس کا
کوئی فرشِ زمیں سے جانبِ افلاک جاتا ہے
دلِ بے تاب کو ہے ذکرِ احمدؐ سے سکوں ایسا
جب ان کا نام لیتا ہوں دھڑکنا بھول جاتا ہے
وہی ہے بحرِ حکمت جو کرے انفاس پاکیزہ
وہی ہے جو ہمیں مفہومِ قرآنی بتاتا ہے
زیارت اس کو ہوتی ہے نبیؐ کے روئے اقدس کی
جو خاکِ کربلا کو آنکھ کا سرمہ بناتا ہے
وہی بھٹکے ہوؤں کو سایۂ رحمت میں لے فرخؔ
وہی گرتے ہوؤں کو ہاتھ سے اپنے اٹھاتا ہے

ناصر بشیر

نعت رسولِ اکرمؐ

جان آپؐ کی حضورؐ یہ دل آپؐ کا حضورؐ!
میری نجات کا ہے یہی راستہ حضورؐ!
میری عقیدتوں کی ہے یہ انتہا حضورؐ!
خاکِ مدینہ مجھ کو ہے خاکِ شفا حضورؐ!
جس ناؤ میں سوار ہوں وہ ڈوبنے لگی
مجھ بدنصیب کے لیے حرفِ دعا حضورؐ!
یہ آپؐ کے کرم ہی سے آئے گا راہ پر
بھٹکا ہُوا ہے دشت میں یہ قافلہ حضورؐ!
مَیں اُمتی ہوں آپؐ کا، پھر بھی گناہ گار
اپنے مقام سے ہوں مَیں نا آشنا حضورؐ!
مَیں نے سفر میں آپ کو ضامن بنا لیا
پیش آسکے گا کیسے کوئی حادثہ حضورؐ!
جو بھی سلوک کیجیے ناصر بشیر سے
اپنی ندامتوں کو لیے آگیا حضورؐ!

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ریاض ندیم نیازی

نعت

بوقتِ استجابت یہ دعا تو کم سے کم نکلے
مدینے جاؤں پھر میرا مدینے ہی میں دم نکلے

مرے سینے میں تیرےؐ نور کی قندیل روشن ہو
دعا ہے یہ مری یارب مرے دل سے صنم نکلے

سند مل جائے مجھ کو اُسوۂ آقاؐ کے پیرو کی
جو خاکِ پائے آقاؐ پر مرا نقشِ قدم نکلے

ہمارے راستے میں پھول برسائے فرشتوں نے
گھروں سے جب بھی ہم سوئے درِشاہِ اُممؐ نکلے

بسر جن کا ہوا ایک ایک پل آقاؐ کی مدحت میں
قیامت میں وہی دلشاد نکلے، محترم نکلے

خداوندا ہمیں عشقِ نبیؐ وافر عطا کر دے
کہ اس دل سے ہمارے خواہشِ جاہ وحشم نکلے

بھٹکتے پھر رہے ہیں امن کی خاطر جہاں والے
جو نکلے رہنما تو آپؐ کے نقشِ قدم نکلے

نوازا تھا جنہیں اللہ نے ایماں کی چاہت سے
تو ان کی سوچ کے سب زاویے سوئے حرم نکلے

محبت اور ولایت مل گئی ان کو زمانے میں
نوازا جن کو آقاؐ نے وہ سب اہلِ کرم نکلے

محمدؐ کی ثنا سے ذہن و دل معمور ہوں میرے
ندیمؔ انؐ کا لبوں پر نام ہو جب میرا دم نکلے

Scanned with CamScanner

ظہور احمد

سلام

نبیؐ کی شان میں لکھنا نہیں ممکن ہوا اب تک
علیؓ کی شان میں لکھنا نہیں ممکن ہوا اب تک

مجھے توفیق دے مولا قصیدہ وہ لکھوں کہ جو
کسی کی شان میں لکھنا نہیں ممکن ہوا اب تک

قصیدہ کیا لکھوں جبکہ غزل لکھنا نہیں آتی
ولی کی شان میں لکھنا نہیں ممکن ہوا اب تک

مجھے تشبیب لکھنا تھی مگر عجزِ بیاں دیکھو
کلی کی شان میں لکھنا نہیں ممکن ہوا اب تک

کلی کیوٹو کے باغوں میں کھلی یا کہ مرے دل میں
کسی کی شان میں لکھنا نہیں ممکن ہوا اب تک

زمیں بدلو ظہور احمد کہ شاید پھول کھل جائیں
سخی کی شان میں لکھنا نہیں ممکن ہوا اب تک

کیوٹو، ٹوکیو، مارچ 003

سلام

محمد ظفر الحق چشتی

کربلا تشنہ لبی، چند فدایانِ حسینؑ
اے فلک دیکھ ذرا یہ سر و سامانِ حسینؑ

دوشِ سر تاج رسالتؐ ہے سواری اس کی
غوث و اقطاب و ولی سب ہیں غلامانِ حسینؑ

بحرِ وحدت کو کھنگالا شہِ اجمیرؒ نے جب
آپ کے ہاتھ لگا گوہرِ عرفانِ حسینؑ

مال و زر دنیا و دیں میری بلا سے نہ رہیں
میرے ہاتھوں سے نہ چھوٹے کبھی دامانِ حسینؑ

گھر سجا رکھا ہے دُلدُل کے لئے اشکوں سے
کیا عجب آج ہو جائے جو احسانِ حسینؑ

ہم کو زر سے نہیں بوذرؓ سے ہے نسبت صاحب
ہم فقیرانِ حسنؑ ہم ہیں گدایانِ حسینؑ

وہ تو ہے وارثِ اقلیم شہؐ کون و مکاں
غم نہیں سلطنتِ شام کا شایانِ حسینؑ

اپنے ہاتھوں سے فرشتوں نے چھپالیں آنکھیں
کیا خبر کیسے کٹی شامِ غریبانِ حسینؑ

میں کہ دریوزہ گرِ آلِ محمدؐ ہوں ظفر
دین و دل نذرِ علیؑ جان ہے قربانِ حسینؑ

Scanned with CamScanner

علامہ اقبال اور موسیقی

لطیف ساحل

زندگی اور فن کا رشتہ ازلی ہے۔فن کے بغیر زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔انسان اپنی ذات میں موجود بے شمار صلاحیتوں کو فنی طور پر بروئے کار لا کر اپنی زندگی کو حسین سے حسین تر بناتا رہتا ہے۔

اقبالؒ نے فن کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اُسے خدمتگار زندگی سمجھا۔انھوں نے فن کو علم کے ساتھ جگہ دی اور اُس کی اہمیت کھلے اور صاف لفظوں میں بیان کی:

علم وفن از پیش خیزان حیات
علم وفن از خانہ زادان حیات

علم وفن، حیات میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنی اپنی انفرادیت کے باوجود ایک دوسرے سے مربوط ہونے کے باعث بعض مقامات پر اکائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔اُن کی یکجائی اُن کی اہمیت کو مسلم بنا دیتی ہے تاہم علم وفن پر حیات کی سبقت برقرار رہتی ہے۔اسی لیے اقبال نے علم وفن کو ''پیش خیزان حیات'' اور ''خانہ زادان حیات'' کہہ کر پکارا ہے۔جس مقام پر علم وفن حیات انسانی سے زیادہ اہمیت اختیار کر جائیں، حیات انسانی تباہی آشنا اور زوال آشکار ہو جاتی ہے۔اقبالؒ اپنے ایک قطعہ ''دین وہنر'' میں فنون لطیفہ کی وضاحت کچھ اس طرح کرتے ہیں:

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام ایک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے اِن کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

اس قطعہ میں اقبالؒ نے فن کے جس پہلو کی طرف سب سے پہلے اشارہ کیا ہے وہ سرود یعنی گیت نغمہ اور راگ ہے۔ تاہم دوسرے فنون کی طرح موسیقی کو اُسی وقت اہمیت دی جا سکتی ہے جب وہ خودی، جو اقبال کے نزدیک جوہر حیات ہے، کے تحفظ کا باعث بنے۔ موسیقی چونکہ انسان کے ضمیر سے پھوٹتی ہے اس لیے اسے آلودہ ملمس نہیں کیا جا سکتا۔ موسیقی کے بارے میں اقبالؒ کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''کلام اقبال کے مطالعے کے بعد اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا رقص اور موسیقی کا تصور، شعر کے تصور سے مختلف نہیں۔ فن و ہنر میں شاعری بھی آ جاتی ہے اور رقص بھی، موسیقی بھی اور بت تراشی بھی، نقاشی بھی اور فن تعمیر بھی۔ اقبال نے ان تمام فنون کو ہماری شخصیت کی گہرائی کا ایک پرتو قرار دیا ہے۔''(۲)

اقبالؒ کے کلام کے حوالے سے ہم جگن ناتھ آزاد کے بیان سے اس حد تک تو اتفاق کر سکتے ہیں کہ شاعری، رقص، موسیقی، نقاشی اور فن تعمیر فن و ہنر کے ایسے پہلو ہیں کہ اہمیت کے اعتبار سے جن کا تصور ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔ لیکن بت تراشی کا مسئلہ بوجوہ دیگر فنون سے مختلف ہے۔ اقبالؒ نے اپنی تحریر میں بت تراشی کو دیگر فنون کے ساتھ اس طرح کہیں بھی پیش نہیں کیا جس طرح جگن ناتھ آزاد نے پیش کیا ہے کیونکہ بت تراشی میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے جب وہ بت پرستی کا حصہ بن جاتی ہے اور عبادت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن اقبالؒ کے خیال میں، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، فن کی حیثیت زندگی کے خدمت گار کی ہے، عبادت کی نہیں۔ ''مرقع چغتائی'' کے دیباچے میں اقبالؒ لکھتے ہیں:

''کسی قوم کی روحانی صحت کا دارومدار اُس کے شعرا اور آرٹسٹ کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک، اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمے یا تصویر سے لوگوں کا دل لبھا سکے، قوم کے لیے چنگیز خان کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔''

موسیقی، نغمے اور رقص کو اقبالؒ نے نہ صرف اپنی شاعری اور تحریر کا موضوع بنایا بلکہ اُن کی گفتگو اور روزمرہ کے معمولات بھی زندگی کے اس پہلو سے معمور ہیں۔ اس لیے اس مقام پر اُن کی شخصیت کا حوالہ دینا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بقول پروفیسر عبدالواحد:

''میں سمجھتا ہوں کہ اقبالؒ کے کلام میں اُن کی مکمل شخصیت دکھائی نہیں دیتی۔''(۲)

اس سلسلے میں پروفیسر حمید احمد خاں رقم طراز ہیں:

Scanned with CamScanner

''اقبال محض ایک فلسفی شاعر اور حکیم ہی نہیں تھا۔ اُس کی شخصیت کے اور بھی پہلو تھے جنھیں ''بال جبریل'' یا ''پیام مشرق'' میں جگہ نہیں مل سکی۔ شاید یہ ممکن بھی نہ تھا۔ ظرافت و بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی و بزم آرائی پیغمبری کا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' (۳)

اس مقام پر ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ لطیفہ گوئی اور بزم آرائی پیغمبر کا ساتھ کیوں نہیں دے سکتی۔ تاہم یہ بات سب پر واضح ہے کہ اقبال کی بزم آرائی بھی عرفانی اور وجدانی کیفیات سے مالا مال تھی۔ جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے اقبالؒ کو ابتدا ہی سے اس سے شغف رہا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں آپ کے کلام اور ترنم سے نہ صرف سحر آفریں فضا قائم ہوئی بلکہ وہ مخصوص لے جس میں آپ شعر سناتے تھے ''حجازی نے'' کے نام سے مشہور ہوئی اور نوجوان شعرا نے اُسے اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے شروع شروع میں اقبال کی مقبولیت میں جہاں اُن کے ارفع و اعلیٰ کلام کا عمل دخل ہے وہاں اُن کے ترنم کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بقول شیخ عبدالقادر:

''بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسۂ عام میں شیخ محمد اقبالؒ سے بہ اصرار کہا کہ وہ نظم ترنم سے پڑھیں۔ ان کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آئند ہے۔ طرز ترنم سے بھی خاصے واقف ہیں۔ ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا اور لوگ جھومنے لگے..... لاہور میں جلسۂ حمایت اسلام میں جب اقبالؒ کی نظم پڑھی جاتی ہے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہوتے ہیں اور جب تک نظم پڑھی جائے لوگ دم بخود بیٹھے رہتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی محو ہوتے ہیں۔'' (۴)

میاں بشیر احمد اپنے مضمون ''اقبالؒ کی یاد میں'' میں لکھتے ہیں:

''اقبالؒ کو پہلے پہل میں نے شیرانوالہ دروازہ کے اسلامیہ سکول میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں دیکھا۔ میں سکول میں پڑھتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے پہلی نظم جو میں نے سنی ''تصویر درد'' تھی۔ ایک حسین نوجوان ''ناک پکڑ'' عینک لگائے، شلوار اور چاندنی جوتی پہنے گریبان کا بٹن کھلا ہوا، سٹیج پر کھڑا خوش الحانی سے ایک مخصوص نے میں پڑھ رہا تھا:

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

یہ یاد نہیں کہ اس کے صحیح معنے بھی سمجھ میں آئے کہ نہ آئے لیکن ہم عمروں کی ٹولی نے بھی خوب سر ہلایا۔ اتنے میں اقبالؒ اپنے شعر گاتے گئے۔ ہم من و ن سے تو واقف نہ تھے، ہم تو اُسے محض گانا سمجھتے تھے۔'' (۵)

مندرجہ بالا اقتباس میں میاں بشیر احمد کا یہ کہنا کہ ''اقبال اپنے شعر گاتے گئے'' یا ''ہم تو اُسے محض گانا سمجھتے تھے'' دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ اقبالؒ کا شعر پڑھنے کا انداز شاعروں کے مروجہ ترنم سے قطعاً مختلف تھا اور موسیقی کے اصولوں یا راگوں کی مناسبت سے گانا محسوس ہوتا تھا۔ اقبالؒ کے ترنم کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ بہت سے شاعروں نے اُن کی پیروی میں ترنم کو اپنایا۔ مرزا ارشد

Scanned with CamScanner

گورگانی نے اپنی ایک نظم میں اس طرف اشارہ کیا ہے:

نظم اقبال نے ہر اک کو گویا کر دیا

مولوی فیروزالدین ربانی فیروز سنز اور مصنف فیروز اللغات، علامہ اقبالؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''پنجاب میں نظموں کو ترنم کے ساتھ پڑھنا انھی کی ایجاد ہے۔''(۶)

اقبالؒ کے اسی ترنم کو شیخ عظیم آنریری جنرل سیکرٹری انجمن حمایت اسلام نے ''حجازی ئے'' کہہ کر پکارا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''حضرت ممدوح (اقبال) کو میں نے پہلی مرتبہ لاہور میں آغاز ۱۹۰۱-۲ء میں دیکھا جبکہ آپ نے شیخ محمد اقبال ایم۔اے کی حیثیت سے اپنی نہایت ہی تاثیر نظم بعنوان ''نالۂ یتیم'' انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے کے موقع پر بڑے دل کش لہجے یعنی ''حجازی ئے'' میں پڑھی۔''(۷)

''شکوہ'' کے آخری بند میں اقبالؒ خود کہتے ہیں:

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا ئے تو حجازی ہے مری

یہ شعر اگرچہ وسیع تر تناظر میں لکھا گیا ہے لیکن اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبالؒ کا وہ ترنم جسے لوگوں نے ''حجازی ئے'' کا عنوان دیا، اقبالؒ کے شعور کا حصہ تھا۔ انھوں نے اپنے ترنم کے لیے اس نام کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ شاعری میں بھی اُس کا اظہار کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس ترنم کو پسند کرتے تھے۔ وہ حجازی ئے کیا تھی اور کیسی تھی؟ اس کا تصور اس وقت یقیناً ناممکن ہے۔ جب اقبال زندہ تھے آخری چند برسوں میں انھیں گلے کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ چاہنے والوں کو حسرت تھی کہ کاش اُن کی آواز میں ترنم کا جادو دوبارہ لوٹ آئے لیکن سوائے ایک ایسی محفل کے جس میں سر عبدالقادر، جسٹس سر عبدالرؤف اور جسٹس سید آغا حیدر موجود تھے، اقبالؒ کبھی ترنم سے کلام پیش نہ کر سکے۔ موسیقی سے اقبالؒ کے شغف کا ذکر کرتے ہوئے سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

''شعر سے رغبت کے ساتھ اقبالؒ کو موسیقی کا بھی بہت شوق تھا۔ اُن کو علم موسیقی سے گہری واقفیت پیدا کرنے کا تو موقع نہیں ملا مگر اُن کے کان موسیقی کی اچھی شناخت رکھتے تھے اور کوئی گاتا ہو تو وہ اُس سے ایسا لطف اٹھاتے تھے جیسے کوئی ماہر فن اٹھائے۔''(۸)

سر عبدالقادر کا اقبال کے موسیقی کے ذوق کو ماہر فن کے مطابق پیش کرنا قابل توجہ امر ہے۔ اس بارے میں یقینی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے موسیقی کے فن کی باقاعدہ تربیت حاصل کی کہ نہیں لیکن بعض شواہد ایسے دستیاب ہیں جن سے موسیقی کے بارے میں اُن کی سمجھ بوجھ کا اندازہ ہوتا ہے۔ فن موسیقی کے بنیادی علم نے انھیں شاعری سمجھنے شاعری کرنے اور لفظوں کے صوتی آہنگ سے فائدہ اٹھانے میں مدد دی۔ وہ اپنی معروف نظم ''آفتاب'' مطبوعہ ''مخزن'' کا تمہیدی شذرہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

Scanned with CamScanner

''ذیل کے اشعار ''رگ وید'' کی نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو ''گایتری'' کہتے ہیں۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعرا ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں حروف علت وصحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔''(۹)

موسیقی دراصل لفظوں کے صوتی آہنگ کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے ایک معمولی شاعر بھی، صوتی آہنگ کی واقفیت کی بنیادی پر، کسی حد تک موسیقار ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے یہاں موسیقی محض لفظوں کے صوتی آہنگ کی آشنائی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی وہ کتابیں، جو طالب علمی کے زمانے میں اُن کے زیر مطالعہ رہیں، اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے راگوں کے بول، ثبوت کے طور پر ہمیں فراہم کرتی ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں جب آپ سکاٹ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں دسویں جماعت کے طالب علم تھے تو انگریزی کی کتاب "Reading of Poetry" اُن کے زیر مطالعہ رہی۔ اسی کتاب پر ایک جگہ انھوں نے راگ کے بول تحریر فرمائے ہیں۔

سا.....رے.....گا.....ما.....پا.....دھا.....نی.....سا

خرج، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت، نکھاد

ایک دوسری جگہ ئے کے بول یوں درج ہیں:

دھا(۲) خرج (خاص) رے(۱) گا(۱) دھا(۱) (خاص)

یا(۱) (خاص) گا رے(۱) سا گا۔(۱) (۱۰)

موسیقی کے ان اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؒ نے ابتدائی طور پر فن موسیقی میں دلچسپی لی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشن سکولوں میں لازمی طور پر موسیقی کا ایک پیریڈ رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ اقبالؒ نے موسیقی کے یہ اشارے شاعری کی کتاب پر تحریر کیے تھے اور انگریزی شاعری سے متعلق اس کتاب پر بیدل، غالب اور ناسخ کے مختلف اشعار درج کیے تھے جس سے اُن کے شعور میں موسیقی اور شاعری کے باہمی ربط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اقبالؒ موسیقی سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اُردو کے قدیم شعرا میں سے بعض اس فن کے ماہر ہو گزرے ہیں لیکن عام طور پر شاعری اور موسیقی کے درمیان حد فاصل قائم رہی ہے۔ متقدمین میں غالباً مصحفی کے سوا کسی نے بھی غزل میں موسیقی کی واقفیت سے کام نہیں لیا۔ دور حاضر میں اقبالؒ نے اس فن سے لگاؤ کے سبب جدا قسم کے ترنم کی داغ بیل ڈالی۔''(۱۱)

اقبالؒ کی زندگی کے اوراق میں ایسے واقعات بھی رقم ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے رقص وسرود کی محفلوں میں شرکت کی اور موسیقی سے حظ اٹھایا۔ اقبالؒ کے بعض پرستار اپنے ذہن میں یہ تصور کرتے ہوئے کہ کہیں اقبالؒ کی عظمت پر کوئی حرف نہ آ جائے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کتراتے ہیں کہ اقبالؒ کو رقص وموسیقی کی محفلوں میں شرکت کا بھی شوق رہا ہے۔ میرے خیال میں اقبالؒ

Scanned with CamScanner

ایک صوفی عارف تھے اور اس پس منظر میں کہ اُن کی رندانہ کیفیات عام لوگوں سے مختلف ہوں گی، ہمیں ان واقعات کی صداقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔

اقبالؒ کی مجلسی زندگی کا یہ دور زیادہ تر مرزا جلال الدین بیرسٹر کی دوستی سے تعلق رکھتا ہے۔ مرزا جلال الدین وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے اور اُن کی رہائش گاہ بھی اقبالؒ کے نزدیک تھی۔ بہت سی معروف شخصیات دونوں کی مشترکہ دوست تھیں۔ اقبالؒ کے معاصرین نے دونوں کی بے تکلفانہ دوستی کے بارے میں جابجا لکھتا ہے۔ خود اقبال مولانا گرامی کو ۴-اکتوبر ۱۹۲۲ء کے خط میں اپنی نئی رہائش گاہ کے بارے میں لکھتے ہیں ''میں نے مکان تبدیل کر لیا ہے۔ مرزا جلال الدین صاحب کے قریب ہے۔'' (۱۲)

''وہ (اقبالؒ) انارکلی میں وہاں اٹھ آئے جہاں کبھی میاں محمد شفیع مرحوم کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ میری رہائش اُن دنوں چمبرلین روڈ پر تھی۔ اس قرب مکانی کی وجہ سے ان سے ملنے جلنے میں مجھے اور بھی سہولت مہیا ہو گئی۔ نواب سر ذوالفقار مرحوم، اقبالؒ اور میں کبھی نواب صاحب کے دولت خانے پر اور کبھی میرے دفتر میں قریب قریب بلاناغہ ملا کرتے تھے۔ ہمارے باہمی تعلقات ایسے گہرے تھے کہ سر میاں شفیع اور فضل حسین مرحوم ہمیں Trio (اصحاب ثلاثہ) کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔'' (۱۳)

محمد عبداللہ قریشی کے بیان کے مطابق ''ایک بار جب نواب ذوالفقار علی اور علامہ اقبالؒ میں کسی بات پر اختلاف پیدا ہوا تو مرزا جلال الدین بیرسٹر جوان دونوں کے مشترک دوست تھے ان کے درمیان مصالحت کرانے کی سعی کی۔'' (۱۴)

ڈاکٹر تاثیر اپنے مضمون ''اسماء الرجال'' میں لکھتے ہیں:

''مرزا جلال الدین بیرسٹر سے (اقبالؒ کے) وکیلی تعلقات کا سلسلہ رندانہ دوستی کی حد تک پہنچ گیا۔'' (۱۵)

مندرجہ بالا اقتباسات کو پیش کرنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ اقبال اور مرزا جلال الدین بیرسٹر کے گہرے مراسم کو تسلیم کیا جائے اور اس حوالے سے اقبالؒ کے بارے میں اُن کی تحریروں کو وہی اہمیت دی جائے جو اقبالؒ کے دیگر شارحین کو دی جاتی ہیں۔ اقبال پر مرزا جلال الدین کی سب سے اہم تحریر ''ملفوظات'' میں شامل کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اقبالؒ ہر شام بلاناغہ میرے ہاں تشریف لاتے۔ ان کو راگ رنگ کا بہت شوق تھا۔ میرے مکان پر چونکہ رقص و سرود کی محفلیں اکثر جما کرتیں اس لیے وہ ان مجالس میں بڑی رغبت سے شمولیت فرماتے۔ میرے ہاں اکثر شام کے وقت محفل و سرود قائم ہوا کرتی جس میں چند ہم خیال دوست شریک ہو جایا کرتے۔ سارا دن عدالتوں میں موشگافیوں میں بسر ہو جاتا۔ رات کے وقت دیر گئے تک مقدمات کی تیاری کے مشاغل درپیش رہتے اور دن چڑھتے ہی از سر نو اس دماغی کاوش میں الجھنا پڑتا۔ اس مسلسل انہماک سے قویٰ مضمحل ہو جاتے اور دماغ نچڑ جانے سے روح پر افسردگی سی چھانے لگتی۔ چنانچہ طبیعت میں تازہ دم ہونے کی خواہش پیدا ہوتی اور دل فراغت کے لمحات کے لیے بے چین ہو جاتا۔ اس پر ہم چند دوست زندگی کے پریشان کرنے والے ہنگاموں سے ہٹ کر خوش وقتی کے لیے ایک مختصر سی بزم قائم

Scanned with CamScanner

کرتے اور اس کی دل کشیوں میں اپنے تھکے ہوئے دماغوں کو تازہ دم کرتے۔ جب اقبالؒ سے میری ملاقات ہوئی تو ان پر بھی اس مجلس کا حال کھلا۔ ادھر میں نے بھی مولوی احمد دین مرحوم سے اُن کی داستان سن رکھی تھی۔ دونوں طرف سے کشش ہوئی اور پہلی ہی صحبت میں ہم سمجھ گئے کہ ہمارے طبائع اور مزاجوں میں ایک حیرت انگیز یکسانیت ہے۔ چنانچہ اقبال کی شمولیت کے بعد ان صحبتوں کی تعداد اور دلکشی میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا۔(۱۶)

رقص وسرود کی یہ محفلیں اس نوعیت کی تھیں جن میں خاص دوستوں کے علاوہ کسی کو مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اقبالؒ کبھی کبھار ایسی محفلوں میں بھی شرکت کر لیا کرتے تھے جو بعض اہم شخصیات کی خوشنودی کے لیے خصوصی طور پر منعقد کی جاتیں۔ ایسی ہی ایک محفل کا حال بیان کرتے ہوئے مرزا جلال الدین لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ لاہور میں پراونشل مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے راجہ نوشاد علی، تعلقہ دار اودھ تشریف لائے۔ میں نے دوسرے دن رقص وسرود کا سامان کیا اور راجہ صاحب کو مع دیگر احباب کے مدعو کیا۔ ہر چند لاہور کی نامور طوائف بلائی گئی تھیں مگر لکھنؤ کا لطف کہاں؟ تھوڑی دیر کے بعد راجہ صاحب نے گانا بند کرا دیا اور اقبالؒ سے فرمائش کی کہ وہ ترنم کیساتھ کچھ سنائیں۔ ہر چند انھوں نے اصرار کیا مگر ڈاکٹر صاحب صاف انکار کر گئے۔ اس سے جلسے میں بدمزگی پیدا ہو گئی۔ جب سب لوگ اُٹھ کر چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہنے لگے ''جو لوگ اپنی وجاہت کے بھروسے پر میری نظم سننا چاہتے ہیں وہ میرے سامعین میں سے نہیں۔''(۱۷)

اقبالؒ نے لاہور سے باہر بھی رقص وسرود کی محفلوں میں شرکت کی۔ ایسی ہی ایک محفل میں اقبالؒ کی شرکت کے حوالے سے مرزا جلال الدین ایک لطیفہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ گئے۔ اجلاس کے ایام میں ایک شام ایسی بھی تھی کہ ہم فارغ تھے۔ اقبالؒ کی طبیعت جب بیکاری سے گھبرانے لگی تو مجھ سے فرمانے لگے ''چلو کہیں چل کر گھڑی دو گھڑی گانا ہی سن آئیں'' میں پہلے تو آمادہ ہو گیا مگر بعد میں کسی اچانک کام کی وجہ سے رُک گیا۔ وہ چل کھڑے ہوئے۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد جب وہ واپس لوٹے تو مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے ''لو آج تمہیں تماشا دکھائیں'' میں نے استعجاب کے عالم میں دریافت کیا ''آخر ہوا کیا؟'' فرمانے لگے ''ہونا کیا تھا: بس آج ایک مولوی صاحب کو ہم نے پکڑ لیا۔ جس طوائف کے ہاں ہم گانا سننے گئے وہیں کہیں اس کانفرنس کے مندوبین میں سے ایک مولوی صاحب بھی ہمارے جانے سے قبل دل بہلا رہے تھے۔ مگر آپ جب وہاں سے چمپت ہوئے تو بوکھلاہٹ کے عالم میں کانفرنس کا دعوتی رقعہ وہیں پھینک آئے۔ ہم پہنچے تو طوائف نے ہم سے کہا کہ جس طرح بھی ہو ہم مولوی صاحب کو تلاش کر کے اُن کی امانت بحفاظت ان تک پہنچا دیں مگر ہم نے یہ سوچا کہ یہ رقعہ نواب وقار الملک بہادر، صدر ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی معرفت کیوں نہ لوٹائیں تا کہ ضابطے کی پابندی بھی ملحوظ رہے اور نواب بہادر بھی دیکھ لیں کہ ''دنیا بھلی سے بھلی ہے۔''(۱۸)

Scanned with CamScanner

دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ستمبر ۱۹۳۱ء میں اقبالؒ بمبئی میں خلافت ہاؤس میں مقیم تھے کہ عطیہ بیگم نے اپنی رہائش گاہ پر انھیں چائے پر مدعو کیا۔ ضیاء الدین برنی اس تقریب کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لان سے سب حاضرین کو ہال میں لے جایا گیا جہاں رقص وسرود کا انتظام تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر تک موسیقی ہوتی رہی اور اس کے بعد رقص ہوا۔ ایک کالی کلوٹی عیسائی عورت نے ''کمالات'' دکھائے۔ رقص کے دوران میں ڈاکٹر اقبالؒ نے ایک کاغذ طلب کیا اور ذیل کے اشعار لکھ کر عطیہ بیگم کی خدمت میں پیش کیے:

ترسم کو قوی رانی زورق بہ سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر
برکشت وبیاباں پیچ، برکوہ بیاباں پیچ
برقے کہ بخ خود پیچد، میرد بہ سحاب اندر
ایں صوت ولآ ویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور جناں حورے ، نالد بہ رباب اندر

(۱۹)

شورش کاشمیری کی معروف کتاب ''اُس بازار میں'' بہت سے نامور شاعروں ادیبوں اور ملکی رہنماؤں کے رقص وموسیقی کے شغف سے پردہ اٹھاتی ہے۔ شورش نے طوائفوں سے ذاتی طور پر رابطہ پیدا کیا اور اُن کی انٹرویو کیے۔ وزیر بائی سے انٹرویو کرنے سے پہلے اُس کے خاندان کا تعارف کچھ اس طرح کرواتے ہیں:

''رنجیت سنگھ سے موزاں بائی کا تعلق تھا۔ وزیر اُسی کے خاندان کا فرد تھی۔ وزیر کی بیٹی ممتاز نے مہاراجہ اندور کو مسحور کر رکھا تھا۔ وہی وزیر اب ٹکسالی کے اندر خستہ حال چوبارے میں زندگی گزار رہی ہے۔ ایک بیٹی ٹکیائی ہے جس کی آمدنی سے کنبہ چلتا ہے۔''(۲۰)

آگے چل کر شورش، وزیر کا انٹرویو درج کرتے ہیں:

شورش: کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کے ہاں بڑے بڑے ادبی وسیاسی راہنما آیا کرتے تھے؟

وزیر: جی ہاں! ہر بڑا آدمی اس کوچے سے رسم وراہ رکھتا تھا۔ یہ دو نسلیں تو میری نظروں کے سامنے سے گزری ہیں۔ دراصل رابع صدی پہلے کے لوگ طوائف کو ایک ثقافتی ادارہ سمجھ کر اس کے ہاں آتے تھے۔ اُن کا معاملہ جسم کا نہ تھا، ایک تہذیب کا تھا۔ وہ بالا خانوں کو ایک کلب سمجھتے اور خوش ہوتے۔ سرسید شوق سے گانا سنتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے چندہ فراہم کرتے وقت انھوں نے طوائف سے بڑی رقم حاصل کی۔ مولانا شبلی بھی آواز کا شوق فرماتے رہتے تھے۔ شرر مرحوم بھی چوک میں ہوا کرتے تھے۔

Scanned with CamScanner

مولانا ابوالکلام آزاد ''غبارِ خاطر'' میں اپنی آشفتہ سری کا اقرار کر چکے ہیں۔ مولانا محمد علی سیاسی سفر میں بھی فیض آباد کی آواز سن آیا کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی امیر بھی پچھلے دنوں مری ہے۔

شورش: آپ نے ان لوگوں کی قربت سے کیا محسوس کیا؟

وزیر: ہم کیا محسوس کرتے، یہ تو جو اُن کی صحبتوں میں رہ چکی ہیں وہی کہہ سکتی ہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ حشر، مختار کو جی جان سے چاہتے تھے۔ امیر سے کبھی اقبال کا ذکر آتا تو وہ مسکرا دیا کرتی۔ کچھ بھی ہو یہ بہت بڑے آدمی تھے۔ ان میں کوئی بھی گنوار کا لٹھ نہ تھا۔ (۲۱)

وزیر سے انٹرویو کرنے سے پہلے شورش، امیر سے بھی مل چکے تھے۔ اسی کتاب میں آگے چل کر وہ امیر سے اپنی ملاقات کا حال ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کی شب پاکستان میں پہلا یوم اقبال تھا..... خان کا اصرار تھا کہ ہم اس کی معیت میں امیر سے ملیں۔ علامہ اقبالؒ آغاز جوانی میں اسی امیر ہی کے معترف تھے اور حسن اتفاق تھا کہ آج اُس کے ہاں کسی تقریب کا اہتمام تھا..... اقبالؒ کے نام سے اُس (امیر) کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک نور سا جاگ اُٹھا، لیکن بسرعت مدھم ہو گیا۔ گویا ایک چُپ سو سکھ.....

ہم نے بات کو طول دینا چاہا اور تقاضا کیا کہ وہ ان صحبتوں کی کوئی کہانی چھیڑے جب اقبالؒ عبدالقادر، گرامی، ناظر وغیرہ باہم حاضر ہوتے تھے۔ لیکن اُسی نے کھوکھلے قہقہوں میں ہمارے استفسار کو سمیٹا۔ پھر ذرا ترش ہو کر کہا ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔'' (۲۲)

ڈاکٹر محمد دین تاثیر اپنے مضمون ''اسماء الرجال اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''مزاج میں رندی موجود تھی۔ اچھی شکل کو اچھی ضرور کہتے تھے لیکن عاشقی کے گنہگار کبھی نہیں ہوئے۔'' (۲۳)

ڈاکٹر تاثیر نے اپنے اس بیان میں عاشقی کے لفظ کو خاص معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ انھوں نے اس لفظ کو جسم پرستی کے متبادل کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس عاشقی کا مطلب یقیناً وہ نہیں جو صوفیا کی شاعری میں سمجھا جاتا ہے۔

اسی نوعیت کا ایک تاثر عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب ''ذکرِ اقبال'' میں رقم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس خاتون سے جو جاوید وغیرہ کی والدہ ہیں، شادی ہو جانے کے بعد اقبالؒ نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں۔ یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔'' (۲۴)

عبدالمجید سالک آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''اقبالؒ عنفوانِ شباب میں اپنے عہد کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہ وہ مصری کی مکھی بنے رہے۔ شہد کی مکھی کبھی نہ بنے لیکن آج بھی اُن کے بعض ایسے کہنہ سال احباب موجود ہیں جو گئے گزرے زمانے کی رنگین صحبتوں کی یاد کو اب تک

Scanned with CamScanner

سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ خود اقبالؒ نے اپنی ابتدائی لغزش کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے تمام ہمنشین اس حقیقت کے گواہ ہیں۔" (۲۵)

ان بزرگوں کے تاثرات اپنی جگہ لیکن اقبال کی زندگی اور اُن کی شاعری میں کسی جگہ بھی انقلاب کا روحانی تصور کارفرما دکھائی نہیں دیتا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
گرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار
ہند کے شاعر وصورت گرو افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

رقص وموسیقی کی محفلوں میں اقبالؒ کی شرکت مسلم اور رنگ ونغمہ سے اقبالؒ کا شغف بجا لیکن بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے ان مشاغل میں بھی تخلیق کے ارفع واعلیٰ مقاصد پنہاں تھے۔ انھوں نے رقص وموسیقی ونغمہ کو کبھی بھی سطحی طور پر نہیں لیا بلکہ وہ کسی تخلیقی لمحے کے فیضان سے بہرور ہونے کے لیے ایسی محفلوں میں شریک ہوتے۔ وہ محفل میں موجود ہوتے ہوئے بھی کائنات اور ذات کے اسرار ورموز میں کھو جاتے۔ اقبالؒ خود کہتے ہیں۔

وہ نغمہ سردی خون غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے تراچہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موج نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

مرزا جلال الدین لکھتے ہیں:

"میں نے دیکھا کہ بعض اوقات رقص وسرود ہی کے دوران میں آپ اپنی کسی نظم کی بنیاد رکھ دیتے تھے۔ گانا جاری ہوتا کہ اقبالؒ کا قلب جذبات سے متاثر ہونے لگتا اور وہ دھیمی آواز میں گنگنانا شروع کر دیتے۔ جس کے ساتھ ساتھ اپنے داہنے زانو کو ہاتھ تھپکتے جاتے۔ اس کیفیت کے آشکار ہوتے ہی اربابِ نشاط کو فی الفور گانے سے بند کر دیا جاتا اور ہمہ تن گوش ہو کر اقبالؒ کی آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی۔ سازندے جو اقبالؒ کی طبیعت سے واقف ہو چکے تھے نہایت مدھم سُروں میں ایک قسم کی تال سی دیتے تھی۔ جس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصوص لے میں، جس کی دلکشی کا اظہار الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا، اپنے اشعار پڑھنا شروع کر دیتے۔ ان کی آواز سازوں کی ہم آہنگی کی وجہ سے کچھ ایسی دلنواز ہو جاتی کہ ایک سماں بندھ جاتا۔ ان کے پڑھنے کے بعد چونکہ پھر

Scanned with CamScanner

گانے کی مجلس کا لطف قائم نہیں رہ سکتا تھا اس لیے گویوں کو رخصت کر دیا جاتا۔

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

والی نظم کی بنیاد بھی ایک ایسی ہی مجلس میں رکھی گئی تھی اور ملی ترانہ کا پہلا شعر بھی اسی حالت میں موزوں ہوا تھا۔(۲۶)

آگے چل کر مرزا صاحب مزید لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب بے فکری کے عالم میں مزے لے لے کر گانا سننے میں مشغول ہوتے اور مغنیہ کوئی نعت چھیڑ دیتی۔ جس کا کوئی شعر ان کے دل پر اثر کر جاتا اور ان پر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ اس کیفیت کے ظاہر ہوتے ہی محفل کا نقشہ بدل جاتا اور ہمیں اس حقیقی اقبالؒ کی جھلک دکھائی دینے لگتی جس کا دماغ حریم ربانی کے جلوؤں سے مدہوش، جس کا دل تجلیات خداوندی سے منور، جس کی نگاہ میں پیغمبرانہ پاکیزگی اور جس کے تخیل میں ملکوتی بلندی تھی۔''(۲۷)

اقبالؒ کے کلام میں ایسے بہت سے اشارے موجود ہیں جن سے رقص و موسیقی اور نغمے کے بارے میں اُن کے احساسات اور نظریات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ایک چینی فلاسفر کے حوالے سے وہ رقص و موسیقی اور شعر کی تعریف ان لفظوں میں کرتے تھے۔:

شعر سے روشن ہے جان جبرئیل و اہرمن
رقص و موسیقی سے ہے سوز و سرور انجمن
خاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم اسرار فن
شعر گویا روح موسیقی ہے، رقص اُس کا بدن

اقبالؒ کی شاعری میں بعض مقامات پر ئے، نغمہ اور نوا کے الفاظ، انقلابی اور روحانی پیغام کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ وہ ترنم اور موسیقی کی ترتیب کو ایک ایسا با معنی آہنگ جانتے ہیں جس کو سمجھنا کائنات کے رازوں کو جاننے کے مترادف ہے۔ اُن کے نزدیک پوری کائنات کسی سرمدی گیت کی طرح ہے جسے سننے کے لیے باطن کا درواہونا ضروری ہے۔

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم وزیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود

اقبالؒ اپنے بارے میں کہتے ہیں:

Scanned with CamScanner

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی ،مقام نغمہ تازی

یہی سبب ہے کہ اقبالؒ اپنے نغموں کو مقدس جانتے ہیں۔نغمہ وموسیقی اُن کا مقصد نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔وہ ایسی شاعری اور ایسی موسیقی کو پسند کرتے ہیں جس سے حوصلہ بلند ہو اور جو زندگی آمیز بھی ہو اور زندگی آموز بھی:

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری وشاعری ونائے وسرود

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

شاعر کی نو! ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

اقبالؒ جانتے تھے کہ موسیقی کی نے کے خاص اتار چڑھاؤ،انسان کو مختلف جذباتی اور وجدانی کیفیات سے ہمکنار کرتے ہیں۔ ایسی کیفیات سے رقص وسرود کے مختلف انداز روپذیر ہونا قدرتی امر ہے لیکن ان کیفیات کا نفوذ عموماً موثر شعر کی موجودگی ہی میں واقع ہوسکتا ہے۔موسیقی کے بارے میں یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں کی موسیقی مختلف ہے اور نہ صرف اُن خطوں کی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے بلکہ اس سے اُن خطوں کے باشندوں کی عادات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔جب کسی قوم کی روایات کمزور پڑتی ہیں تو وہ قوم اخلاقی طور پر بھی کمزور ہوجاتی ہے۔اسی حقیقت کو اقبالؒ وسیع تر معنوں میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اُس قوم کے حق میں عجمی نے

غرضیکہ اقبالؒ نغمہ،موسیقی اور ترنم کے بارے میں اتنے ہی حساس ہیں جس قدر وہ شاعری یا دیگر فنون کے بارے میں ہیں۔وہ اپنے پیغام کے ساتھ ہمارے ذہنوں کو چمکانا اور اپنے ترنم سے ہماری روحوں کو گدگدانا چاہتے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام ،خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

حوالہ جات:

۱۔اقبالؒ اور اُس کا عہد،جگن ناتھ آزاد،عیس اُردو،آباد،۱۹۶۵ء صفحہ۔۱۰۵۔

Scanned with CamScanner

2۔اقبالؒ کی شخصیت اور شاعری، پروفیسر حمید احمد خاں، صفحہ ۱۲۔
3۔اقبالؒ کی شخصیت اور شاعری، پروفیسر حمید احمد خاں، صفحہ ۱۷۔
4۔دیباچہ ''بانگ درا'' از شیخ عبدالقادر۔
5۔ملفوفات اقبال، مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۲۰۔
6۔اقبالؒ کے ہم نشیں، مرتبہ صابر کلوروی، صفحہ ۹۵۔
7۔کریسنٹ (اقبال نمبر) اکتوبر ۱۹۳۸، صفحہ ۱۰۔
8۔ملفوفات اقبال، مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۱۰۔
9۔مخزن ۱۹۰۲ء۔
10۔اقبالؒ درون خانہ، خالد نذیر صوفی، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۱ء، صفحہ ۱۰۵۔
11۔تنقیدی مطالعے، از ڈاکٹر وحید قریشی، صفحہ ۹۸۔
12۔اقبال کی صحبت میں، ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، صفحہ ۴۲۔
13۔ملفوظات اقبال، مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۶۲۔
14۔معاصرین اقبالؒ کی نظر میں، محمد عبداللہ قریشی، اکادمی ادبیات لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحہ ۲۶۷۔
15۔مقالات تاثیر، مرتبہ ممتاز اختر مرزا، صفحہ ۱۰۱۔
16۔ملفوظات اقبال، مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۸۶۔
17۔ملفوظات اقبالؒ، مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۷۰۔
18۔ملفوظات اقبالؒ، مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۸۸۔
19۔اقبالؒ کے ہم نشیں، مرتبہ صابر کلوروی، صفحہ ۷۰۔
20۔اُس بازار میں، از شورش کاشمیری صفحہ ۱۹۳۔
21۔اُس بازار میں، از شورش کاشمیری، صفحہ ۱۹۶-۱۹۷۔
22۔اُس بازار میں، از شورش کاشمیری، صفحہ ۲۱۲۔
23۔مقالات تاثیر، مرتبہ ممتاز اختر مرزا، صفحہ ۱۰۲۔
24۔ذکر اقبالؒ، از عبدالمجید سالک، صفحہ ۷۰۔
25۔ذکر اقبالؒ، از عبدالمجید سالک، صفحہ ۷۱۔
26۔ملفوظات اقبالؒ، مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۶۸۔
27۔ملفوظات اقبالؒ، مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۸۷۔

Scanned with CamScanner

پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین، لیہ

لیہ۔۔۔۔۔ایک علمی اور ادبی مرکز

بلاشبہ لیہ ملک کے علمی، ادبی اور تہذیبی مراکز سے کوسوں دور ہے اور یہاں زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اِس شہر کے زیادہ تر لوگ زراعت کے پیشے سے منسلک ہیں مگر گزشتہ دو دہائیوں سے یہ شہر ایک بڑے تعلیمی شہر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ جس سے جہاں جویانِ علم کی تعلیمی پیاس بُجھ رہی ہے وہاں نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد کو روزگار کے مواقع بھی میسر آئے ہیں۔ شعر وادب اور علم ودانش کے تناظر میں یہ ایک اہم مرکز میں ڈھل رہا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل اور قیامِ پاکستان کے فوری بعد یہاں کی وہ اہم ترین شخصیات ہیں جن کی علمی، ادبی، شعری اور تعلیمی خدمات کو ہر دور میں سراہا گیا ہے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے راجہ عبداللہ نیاز، دامن ابا سینی، رب نواز شکستہ اور محمد حسین آزاد بزدار علم وادب کے افق پر روشن رہے۔ محمد حسین آزاد بزدار (۱۸۷۵۔۱۹۵۶) نے شاعری کے علاوہ نثر نگاری بھی کی۔ برِصغیر کے نامور ادیب سوامی رام تیرتھ کی شخصیت اور ادبی خدمات پر آپ کا ایک مضمون "زمانہ" کانپور (انڈیا) میں شائع ہوا اور مولانا ظفر علی خان کے بارے میں ان کا ایک مضمون "زمیندار" کے جوبلی نمبر میں شائع ہوا۔ محمد حسین آزاد (بزدار) سوامی رام تیرتھ کے ہمسفر تھے۔ دونوں کی باہمی ملاقات بذریعہ خط کتابت ہوئی تھی۔ سوامی رام تیرتھ کی وفات سے انہیں گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ اُنہوں نے غالباً ۱۹۰۶ء کے آخر میں سوامی رام تیرتھ کے حوالے سے ایک خط بھی نارائن سوامی کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ جو ''جدائی'' کے عنوان سے کیدار ناتھ پربھاکر کی مشہورِ زمانہ کتاب ''رام بادشاہ'' میں شامل ہے۔ یاد رہے کہ سوامی رام تیرتھ کی وفات پر ڈاکٹر علامہ اقبال نے بھی ایک نظم بعنوان ''وفاتِ سوامی رام تیرتھ'' لکھی تھی جو ''بانگِ درا'' میں شامل ہے۔ اِسی دور میں بھگوان داس چمن، امر جیت، رام داس نوا، فتح محمد کلاچی، رائے کنول نین، برجس گابہ اور موہن لال آسا رام لیہ میں ایک منفرد علمی وادبی مقام رکھتے تھے۔ برِصغیر میں اُردو کے محقق، نقاد اور ادیب گوپی چند نارنگ نے اپنی ابتدائی تعلیم اِسی شہر سے حاصل کی، اِسی طرح کے۔ ایل۔ گابا جیسی شخصیت کا خاندان بھی اِسی شہر کا واسی تھا۔ ان کی رہائش اور تعمیر کی گئی دیگر عمارات آج بھی لیہ میں موجود ہیں۔ دھینگڑا خاندان کی تعلیمی خدمات لیہ کا ایک بڑا حوالہ ہے۔ جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کرے گی، اِس خاندان نے لیہ میں

Scanned with CamScanner

تعلیم کے میدان میں ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں، گورنمنٹ ایم۔سی ہائی سکول لیہ اس کی بڑی مثال ہے اور یہ المیہ بھی تاریخ کو یاد رہے گا کہ اس سکول کی سیکڑوں ایکڑ اراضی لیہ کے ہوس پرست زمینداروں نے اپنے اپنے نام کرالی اور ڈکار بھی نہ لیا۔

علامہ راجہ عبداللہ نیاز، مولانا ظفر علی خان کے پرچے ''زمیندار'' میں چھپنے والے اہم لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔آپ نے شاعری کے ساتھ نثر میں بھی خاصا کام کیا، انہیں ڈرامہ نگاری سے خاص لگاؤ تھا۔ان کے کئی ڈرامے شائع اور سٹیج ہوئے، "مکافاتِ عمل" اور "جنگِ یورپ" ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ڈرامہ نگاری کے علاوہ آپ ماہانہ "نخلستان" سے بھی وابستہ رہے اور بہت سا اداراتی کام کیا۔درس وتدریس سے وابستہ علامہ مرید حسین ڈوگر نے کئی شاعر وادیب پیدا کئے جن میں گوپی چند نارنگ سرِ فہرست ہیں۔گوپی چند نارنگ نے اپنی تحریر وتقریر میں ہمیشہ علامہ مرید حسین ڈوگر کا اعتراف کیا ہے۔حکیم فدا حسین اویس کا شمار عاشقانِ اقبال میں ہوتا ہے اُن کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے باقاعدہ علامہ اقبال کا تلمذ اختیار کیا تھا۔''موازنہ اقبال اور غالب'' اُن کی مستند علمی کتاب ہے۔قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر مہر عبدالحق سمرا اور بابا غلام محمد قاصر بڑے دانشور کے طور پر سامنے آئے۔بابا غلام محمد قاصر معروف مارکسٹ تھے، انہیں فلسفہ، عمرانیات اور سیاست سے گہرا شغف تھا۔مارکسی فلسفے پر ان کی ایک تصنیف بعنوان "جدلیات" مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔شیخ اللہ ڈیوایا سمبل قیامِ پاکستان سے پہلے سے شاعری کرتے آئے اور نسیم لیہ وغیرہ کے عہد شباب تک شاعری کرتے رہے، ان کی مطبوعہ تصنیف تو سامنے نہ آسکی مگر مسودات آج تک موجود ہیں جن پر برکت اعوان نے "امروز" میں ایک "بھرواں" مضمون بھی لکھا تھا۔عنایت اللہ خان حیرت معروف دانشور جناب منور بلوچ کے والد محترم تھے نے بھرپور شاعری کی، ڈاکٹر قیصر عباس رضوی، فضل الحق رضوی، طاہرہ امان، مولانا محمود الرحمان، ارمان عثمانی، عدیم صراطی، نادر قیصرانی، گلزار محبوب اور غافل کرنالی قیامِ پاکستان کے بعد تک شاعری کرتے رہے۔

نسیم لیہ، ڈاکٹر خیال امروہوی، نذیر چودھری اور شہباز نقوی نے اُردو اور پنجابی شاعری کو دلکش اسالیب سے مالا مال کیا اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت پائی۔لیہ شہر سے باہر مضافات میں شوکت ہاشمی، کیف شکوری، رئیس قمر، لطیف فتح پوری اور ان سے پہلے شارق انبالوی نے خوبصورت شاعری کی۔قیامِ پاکستان کے بعد لیہ میں آباد ہونے والے شعراء میں فرمان پٹیالوی، ذاکر جگرانوی، عبدالغفار عابد، پروفیسر ساقی الحسینی وغیرہ اہم ہیں۔خیال امروہوی، غافل کرنالی وغیرہ اِن کے سوا ہیں۔

ان شعراء اور ادباء کے عہد کے بعد شاعروں اور ادیبوں کا ایک عظیم سلسلہ ہے۔جو آج بھی تواتر کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ان میں شعیب جاذب، ڈاکٹر اشو لال، پروفیسر شفقت بزدار، پروفیسر نواز صدیقی، حمید الفت ملغانی، پروفیسر ڈاکٹر گل عباس اعوان، ناصر ملک، ڈاکٹر فیاض قادری، موسیٰ کلیم، مزار خان، صابر عطا، خالد شانی، سلیم آکاش، طارق گوجر، قاضی راشد، منور بلوچ، ڈاکٹر افتخار بیگ، ریاض راہی، جسارت خیالی، طاہر مسعود مہار، رضا کاظمی، م۔قادر یوسفی، عقیل شید آر۔بی، پروفیسر اختر وہاب، عبداللہ نظامی، شمشاد سرائی،

Scanned with CamScanner

امان اللہ کاظم، منظور بھٹہ، مظہر یاسر، شاکر کاشف، شعیب بخاری، منشی منظور، وقار بخاری، جمعہ خان آسی، قطب سلطان، سلیم اختر ندیم، جمشید ساحل، ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر امیر ملک، فرح تحسین بخاری، رانا عبدالرب، عمران عاشر، روشن عزیز نیازی، رفیق ہمراز، شفقت عابد اور قاسم عارض شامل ہیں۔

لیہ کو ایک یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس شہر سے تعلق رکھنے والے بہت سے ادیب، شاعر اور دانشور ایسے ہیں جنہوں نے یہاں سے جا کر خود کو شعر و ادب اور قلم کتاب سے اپنا تعلق بحال رکھا اور لیہ کی شناخت بنے۔ ان شخصیات میں جعفر بلوچ، نسیم عادل، پروفیسر اکرم میرانی، کاشف مجید، سلیم گورمانی، احسن بٹ، ذکی تنہا، تنویر شاہد محمد زئی۔ افضل صفی، احمد اعجاز اور رؤف کلاسرہ نمایاں ترین نام ہیں۔ بقول شخصے کہ شہروں کی پہچان تصانیف اور علم و ادب ہوتا ہے۔ لیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ہر عہد میں شعر و ادب کے افق پر بڑے نام ستاروں کی طرح جگمگاتے رہے۔ ملی اور قومی شاعری پر نگاہ ڈالیں تو راجہ عبداللہ نیاز، غافل کرنالی اور جعفر بلوچ دکھائی دیں گے۔ لسانیات اور لسانی تحقیق میں ڈاکٹر مہر عبدالحق اور امان اللہ کاظم معتبر حوالے کے طور پر موجود ہوں گے۔ نثری تخلیق میں ناصر ملک، شعیب بخاری، جمشید ساحل، احمد اعجاز اور ڈاکٹر افتخار بیگ نے بنیادی نوعیت کا کام کیا۔ تاریخ نگاری میں میاں الٰہی بخش سرائی، اکرم میرانی، برکت اعوان، خاور تھلوچی، نور محمد تھند اور ناصر ملک قابل ذکر ہیں۔ صحافت میں عبدالحکیم شوق اور ان کے خاندان کے کئی افراد معتبر مقام پر فائز ہیں۔ ان کے علاوہ گلزار محبوب مرحوم، برکت اعوان، غافل کرنالی، ریاض روحانی، منیر عاطف، فرید اللہ چودھری، محسن عدیل، ارشد حفیظ، صابر عطا، سعید باروی، عثمان شاہ، ملک مقبول الٰہی، عبداللہ نظامی، مظہر کھوکھر، زاہد واندر، انجم صحرائی، یعقوب مرزا، یامین مغل وغیرہ نے ''ہر حوالے'' سے فعال کردار ادا کیا ہے۔

شعر و ادب کی جامعاتی تحقیق میں لیہ کے محققین نے شاندار خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان میں معلوم نام یہ ہیں: زبیدہ افضل، ڈاکٹر خیال امروہوی، ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر نذیر علوی، پروفیسر اختر وہاب، کاشف مجید، ڈاکٹر افتخار بیگ، ڈاکٹر گل عباس اعوان، شاہین اختر، ڈاکٹر فرحانہ منظور، ڈاکٹر رضیہ امین، فرحان یاسر چاند، افضل صفی، عطیہ یاسمین، نعمان، طاہر مسعود مہار، ریاض راہی، حمید الفت ملغانی، بانو بلوچ، ڈاکٹر امیر ملک، عطا محمد عطا، قاضی راشد، کرامت کاظمی، مظہر شاہ، جرات عباس شاہ، ریاض دستی، راقم وغیرہ۔

دینی ادب اور سیرت نگاری میں مولوی غلام حسین مرحوم، ڈاکٹر مہر عبدالحق اور م۔ قادر یوسفی نے اپنی اپنی خدمات سرانجام دیں۔ غزلیہ اور نظمیہ شاعری میں راجہ عبداللہ نیاز سے لے کر لمحہ موجود تک اہم شعراء کا تعلق لیہ سے رہا ہے۔ سرائیکی شعر و ادب میں ڈاکٹر اشو لال، پروفیسر شفقت بزدار، حمید الفت ملغانی، منظور بھٹہ اور ڈاکٹر گل عباس اعوان اب لیہ کا بڑا حوالہ ہیں۔

لیہ میں مقامی اخبارات اور ایف۔ ایم ریڈیو نے بھی شعور کی سطح بلند کرنے میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ اخبارات کے ادبی ایڈیشن اور علمی اور ادبی سرگرمیوں کی رپورٹنگ نے نئے لکھاریوں کی خوب حوصلہ افزائی کی ہے اسی طرح ایف۔ ایم ریڈیو پر تواتر سے علمی،

Scanned with CamScanner

ادبی اور سیاسی موضوعات پر مبنی مذاکرے ہوتے رہتے ہیں جن سے یہاں کی علمی فضا ہمیشہ سازگار رہتی ہے۔

ادبی تنظیمیں شعروادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لیہ کی یہ شناخت ہے کہ یہاں قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل علم وادب کی ترقی کے لیے باضابطہ ادبی انجمنیں معرضِ وجود میں آئیں اور انہوں نے تشنگانِ علم ادب کی پیاس بجھائی۔ ان علمی انجمنوں کے نام یہ ہیں: بزم علم وادب، بزم ارباب سخن لیہ، مجلس لیہ، قصر ادب لیہ، نیرنگ ادب لیہ، بزم تخلیق نو، بزم سرائیکی چمن، بزم لطیف، خیال اکیڈمی ضلع لیہ، تھل ادبی اکادمی ضلع لیہ، بزم اخوت لیہ، نادر سرائیکی سنگت لیہ، بزم اردو لیہ، تھل دمان سرائیکی سنگت لیہ، بزم اہل قلم لیہ، لیہ ادبی ثقافتی سنگت لیہ، سانول سنگت لیہ، باہو سرائیکی سنگت لیہ، تھل بیٹ سرائیکی ادبی سنگت جمن شاہ لیہ، بزم شعور نو، قلم قبیلہ (لیہ شاخ)، بزمِ علم وفن (لیہ شاخ) لیہ، ادبی فورم لیہ، فروغِ ادب لیہ، تحریکِ حقوقِ انسانیت لیہ، بزمِ افکارِ لیہ، ایوانِ ادب کوٹ سلطان اور پراگریسو سٹڈی سرکل لیہ وغیرہ۔ ان ادبی تنظیموں میں سے بیشتر فعال ہیں اور ان کے ہفتہ وار اور ماہانہ اجلاس تواتر سے ہوتے ہیں جن میں شعروادب کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی ہے۔

ادبی مجلّے علم وادب کا ایک معتبر حوالہ تصور ہوتے ہیں ان ادبی مجلوں میں کالجز کے مجلّات کا کردار بھی قابلِ ستائش ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں تھل، آباد کار، خورشید صحرا اور سلطان قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ تعمیر ادب، نیا قدم، مقامی سیاست، سوجھل سویل، موذنِ صحرا، بصارتیں، اُردو سخن ڈاٹ کام اور سہ ماہی غزل نے شعراء وادباء کی نگارشات کو بڑے پیمانے پر متعارف کرانے کی ذمہ داری پوری کی ہے۔

اس علمی اور ادبی پس منظر کے علاوہ درس وتدریس کے شعبے میں بھی لیہ ایک الگ حیثیت کا حامل شہر ہے یہاں پر قدیم تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ پبلک سکولز اور دینی مدرسے موجود ہیں اس وقت ملک کی تین جامعات کے سب کیمپسز یہاں کام کر رہے ہیں اور دو مزید آنے والے ہیں بلکہ اُمید کی جاتی ہے کہ عنقریب یہاں ایک مکمل یونیورسٹی کا قیام عمل بھی میں آجائے گا۔ اس سلسلے میں لیہ کے سر سید جناب مہر اعجاز احمد اچلانہ کی خدمات کا اعتراف بھی لازم ہے انہوں نے لیہ اور اس کے مضافات میں سرکاری شعبے میں کئی تعلیمی ادارے قائم کرادیئے ہیں جن میں چھے کالجز اور ایک سب کیمپس قابلِ ذکر ہے۔ یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ تعلیم کا رجحان وہیں ہوتا ہے جہاں علم وادب کا ماحول پہلے سے اپنا رنگ جما رہا ہو اور اس تناظر میں لیہ ایک منفرد نوعیت کا علمی اور تعلیمی شہر ہے۔

تخلیق، تنقید اور تحقیق کے ساتھ ساتھ لیہ کے اہلِ دانش نے تراجم نگاری میں بھی عمدہ کام کیا ہے۔ ڈاکٹر خیال امروہوی، حمید الفت ملغانی، پروفیسر مقبول الٰہی شیخ اور احسن بٹ نے کئی اہم کتب کے اردو زبان میں تراجم کئے ہیں۔ احسن بٹ نے تو ستر کے لگ بھگ تراجم کر کے اردو زبان کی وسعت میں اضافہ کیا ہے۔ لیہ میں ان علمی اور ادبی رنگوں میں ایک رنگ روزانہ کی بنیادوں پر وہ مجالس اور محفلیں ہیں جہاں لیہ کے دانشور سیاست، ادب اور دیگر عمرانی موضوعات پر کھل کر بحث کرتے ہیں۔ سرائیکی وسیب میں یہ واحد شہر ہے جہاں کئی جگہوں پر اہلِ دانش مل بیٹھتے ہیں اور نوجوانوں میں سیاسی، تہذیبی اور ادبی شعور میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔ ہاؤسنگ کالونی کی مارکیٹ،

Scanned with CamScanner

نہر کے کنارے لب نیلم کے مقام پر، چوک قصاباں، لیکھی خاندان کا ڈیرہ، ضلعی افسر اطلاعات کا دفتر اور پریس کلب علمی اور ادب بیٹھکوں کے لئے مخصوص ہیں۔ انہی محافل کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کا سیاسی شعور بہت بلند ہے یہاں پر اکثر لوئر مڈل کلاس کے سیاسی کارکن ارکانِ اسمبلی بنے ہیں اور یہاں کے باسی جمہوری اقدار کے بڑے محافظ تصور ہوتے ہیں اور سیاست اور دیگر علمی مباحث کی جملہ باریکیوں پر اپنی اپنی صائب رائے رکھتے ہیں۔

اس ساری بحث کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے جن کے پیشِ نظر "لیہ" کی سرائیکی وسیب کا ایک بڑا علمی اور ادبی مرکز بنا ہے۔ اگرچہ یہاں کی اشرافیہ ملتان اور بہاولپور کی اشرافیہ کی طرح علم وادب کی سرپرستی نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود اپنی مدد آپ کے تحت یہاں کا شاعر اور ادیب ایک فعال کردار ادا کر رہا ہے۔ یہاں کے بہت سے ایسے ادیب اور شاعر ہیں جن کی کتب ملک کی بڑی جامعات کے نصابوں کا حصہ ہیں: ڈاکٹر مہر عبدالحق، حمید الفت ملغانی، ڈاکٹر گل عباس اعوان، ڈاکٹر اشو لال، مزار خان، ڈاکٹر ظفر عالم ظفری، جعفر بلوچ، شہباز نقوی اور راقم کی اکثر کتب انٹر سے ڈگری اور پوسٹ ڈگری تک پڑھائی جاتی ہیں۔ اس طرح سے دبستان لیہ کی علمی اور ادبی خدمات کا یہ ایک بڑا اعتراف بھی ہے۔

ٹی۔ وی کے ایک مذاکرے میں فہیم اعظمی، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فتح محمد ملک نے لیہ کو ایک دبستان قرار دیا اور کہا کہ اب ادب بڑے مراکز سے لیہ جیسے چھوٹے اور مضافاتی شہروں میں منتقل ہو رہا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا عوامل ہیں کہ دور افتادہ اور مراکز سے دور ہونے کے باوجود اس شہر کی فضا علم وادب کی خوشبو سے معطر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لیہ کو قیام پاکستان سے قبل ہی سے علم وادب کی ایک توانا اور مضبوط روایت ملی اور پھر ہجرت کر کے آنے والے بہت سے شعراء اور ادباء نے بھی علمی ماحول کو بہتر بنایا اور اسی طرح ملازمت کے سلسلے میں آنے والے بہت سے شعراء اور ادباء نے بھی علمی ماحول کو بہتر بنایا۔ ان شعراء میں مصطفیٰ زیدی، شکیب جلالی، مجید امجد، تحسین فراقی، انجم نیازی اور ڈاکٹر لیاقت نیازی جیسے لوگوں کے نام نمایاں ہیں۔ اس علمی اور ادبی منظر نامے کے پیشِ نظر یہ کہنا بجا ہے کہ "لیہ" ایک بڑا دبستان ہے جہاں تخلیق ہونے والے شعر وادب کا لہجہ اور موضوعات سرائیکی وسیب کے دیگر اضلاع کے ادب سے یکسر الگ اور منفرد ہیں۔ ترقی پسندی، جمہوری رویوں کا اظہار اور انسان دوستی یہاں کے ادب کے حسین پہلو ہیں۔ فنی اعتبار سے بھی لیہ میں تخلیق ہونے والی شعریات اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں، غافل کرنالی کی ملی شاعری، نسیم لیہ کا گھن گرج والا لہجہ، خیال امروہوی کی انقلابی اور مزاحمتی شاعری اور پروفیسر شہباز نقوی کی لطیف غزلیہ شاعری نے دبستان لیہ کو ایسی ایسی تخلیقی ادائیں عطا کی ہیں کہ لیہ علمی اور ادبی مراکز کی برابری کرنے لگا ہے۔ اگر یہاں سے حکومتی سرپرستی میں کسی بڑے ادبی مجلے کا اجراء ہو جائے تو ملکی سطح پر فکر و شعور کی سطح میں اضافہ کرنے میں دبستانِ لیہ معاونت کرنے لگے گا۔

☆.....☆☆☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

تجزیہ

زاہد مسعود کی نظم ''ہم لوگ''

تنویر قاضی

گلوبل ولیج کی Demand تھی کہ شاعری ترسیل کرتی ہوئی بھکشو بھکشو ہر در پہ دستک دے یہ جبھی ممکن تھا کہ تخیل Diction کو Deminate کرے۔نثر کے پیرائے میں رہتے ہوئے شاعری کرنا ایک خوبصورت تجربہ ٹھہرا۔سو آج نثری نظم ۔ے انکار پوری شاعری سے انکار کے مترادف ہے۔نثری نظم گھنے جنگل کی جبلت،سفاکی اور پہنائی سے نبرد آزما ہو کر واپسی کا راستہ ڈھونڈنے جیسی ہے۔میری ذاتی رائے میں نثری نظم میں وہ شاعر زیادہ کامیاب ہوئے جو غزل کے راستے سے آئے تھے۔زاہد مسعود کی نثری نظم اس لئے اوپری نہیں لگتی اور اکہرے پن کا شکار بھی نہیں ہونے پاتی کہ وہ اپنے Local اور Fokclore کا دامن نہیں چھوڑتا۔

زاہد مسعود کی نظم ''ہم لوگ'' کا چناؤ میں نے اس لئے بھی کیا کہ اس کا موضوع ''ڈر'' ہے۔ماحول میں ڈر ایک تشدد کی شکل اختیار کرتا ہے جو ہماری رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔یہ نظم اپنے میں عجیب طرح کا غم لیے ہوئے ہے جو سانجھا سا لگتا ہے۔خوف انسانوں کا ازلی ساتھی مگر Prevailing Fear اور طرح کا ہے۔گھر جو عافیت کا Symbol ہوتا تھا،جنگل سا ہو کر رہ گیا۔جہاں ہر لمحے درندے معصوموں پر جھپٹنے کے لئے جھاڑیوں میں چپ سادھے بیٹھے ہوتے ہیں۔اڑانیں غیر محفوظ،مچانیں جدید اسلحے سے لیس،اپنے گھونسلوں میں بے اماں پرندوں کی طرح کراہتا ہوا دیکھتے ہی گولیوں کی بوچھاڑ میں شہر کی گلیاں لہو میں نہا جاتی ہیں۔نظم ''ہم لوگ'' جتنی سیدھی سادی ہے اس کے پچھواڑے دکھ اتنا ہی گھمبیر دکھتا ہے۔''شیزوفرینا'' کے مرض کو بڑھاوا دینے والا ڈر چوکھٹ چوکھٹ دیمک بنتا لوگوں کو برہنگی کی رسی پر ٹانکتا ہانپتا ہے۔دل یادیں رکھنے کے لئے تھے ہم نے وہاں ڈر پال رکھے ہیں۔باغوں،درختوں،پینگوں کو جنوں،چڑیلوں اور چھلی پیریوں کا تصور دیتی Hallucination ہمیں مکانوں میں مقید کر دے گی۔

Tranquilliser لینے سے بہتر ہے چلو زاہد مسعود کی اس نظم کے جلو میں شاعر کی مایوسی کی حمایت میں نظمیں لکھیں۔کہانی کار اندھیرے میں ڈوبی کہانیاں تحریر کریں،مصور یاسیت کے پہاڑ پینٹ کریں۔مجسمہ ساز ناامیدی کے ڈھیروں مجسمے چوراہوں میں گاڑھ

Scanned with CamScanner

دیں۔ موسیقار افسردہ دھنیں ترتیب دیں اور غمگین گائیکی کا ساتھ ویراں راستے کے جھنگیر دیں۔ یہ ساری Anxiety اپنے اندر کہیں انقلاب آفریں چہرہ ضرور رکھتی ہوگی۔ نظم ''ہم لوگ'' کے لوگ کھلی چھت پر سونے سے خائف ہیں اس قبیل کی نظموں کے بطن میں حوصلگی کی رمق جرأت کے وسیع امکانات دل و دماغ کو عطا کرتی ہے۔ خوف زدہ بلی کی پسلی سے ایک دھاڑتا ہوا شیر جنم لیتا ہے۔ کوئلے کی غار جیسی موت سے نڈر انسان کی پنجہ آزمائی جو کہ اس Specie کی سرشت میں ہے مقفل دروازے کھولے گی۔

(زاہد مسعود کی نظم ''ہم لوگ'' کے تناظر میں)

ہم لوگ

زاہد مسعود

جو ڈرتے ہیں
سڑکوں پر پیدل چلنے سے
راہگیروں کی موت مرنے سے
ہم لوگ
جو گھروں میں رہنے سے ڈرتے ہیں
ہمارے نام لکھی گئی گولی
اور اجنبی قاتل ہوا مقفل دروازوں کے آر پار گزر سکتی ہے
ہم لوگ
جو کھلی چھت پر نہیں سوتے
اور بند قبروں سے ڈرتے ہیں

نمود کی سرپرستی کیجئے
دامے درمے، سخنے، قدمے
تعاون کیجئے

Scanned with CamScanner

ناصر بشیر

اصطلاح سازی کے بنیادی مباحث

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ لفظ کے دو طرح کے معنی ہوتے ہیں۔ ایک لغوی اور دوسرے مجازی لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی لفظ کسی علم سے وابستہ افراد خاص معنی میں استعمال کریں تو وہ اس کے اصطلاحی معنی قرار پاتے ہیں۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دراصل لفظ کے تین طرح کے معنی ہوتے ہیں ایک لغوی معنی دوسرے مجازی معنی اور تیسرے اصطلاحی معنی، بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ہم اس بات پر غور کر لیتے ہیں کہ لغوی، مجازی اور اصطلاحی معنی کیا ہوتے ہیں۔

کسی لفظ کے وہ حقیقی معنی جو لغت میں درج ہوں اس لفظ کے حقیقی معنی کہلاتے ہیں۔ مثلاً شیر کے لغوی معنی ہیں ایک درندہ جو گوشت کھاتا ہے اور جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو بہادر یا دلیر کہنے کے لیے ہم اسے شیر کہیں تو یہ اس لفظ کے مجازی معنی ہوں گے۔ اسی طرح ہم ایک اور لفظ لیتے ہیں بحر۔ بحر کا لغوی مطلب ہے سمندر لیکن اہل سخن کے نزدیک بحر وہ ارکان ہیں جن سے کسی شعر کا وزن پرکھا جاتا ہے۔ یہ بحر کے اصطلاحی معنی ہیں۔ اسی طرح لفظ آمد کا لغوی مطلب ہے۔ آنا۔ لیکن شاعری کا علم جاننے والے اس سے مراد شعر کا نازل ہونا، لیتے ہیں اسی طرح اگر لغت میں دیکھا جائے تو فرد کا مطلب ہے ایک آدمی لیکن اہل شعر و سخن کے نزدیک اسی کا مطلب ہے ایک شعر۔

اس مختصری بحث کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ اصطلاح کا تعلق ضرور کسی نہ کسی علم سے ہوتا ہے۔ معنی کی اقسام کے حوالے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ لغوی معنی دنیا بھر میں ایک ہی رہتے ہیں۔ یہ بدلتے نہیں۔ مثلاً اگر ہم لفظ شیر کا مطلب بھارت میں چھپنے والی لغت میں تلاش کریں گے تو وہاں بھی وہی مطلب لکھا ہوا ملے گا جو لندن میں چھپی ہوئی لغت میں درج ہوگا۔ البتہ لفظ کے مجازی معنی مختلف معاشروں میں الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ مجازی معنی کثرت استعمال سے آپ ہی آپ تشکیل پاتے ہیں اس لیے یہ ہر معاشرے کی اپنی روایات اور ثقافت کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً برصغیر پاک و ہند میں بے وقوف شخص کو اُلو کہا جاتا ہے لیکن اہل مغرب کے

Scanned with CamScanner

نزدیک اُلو عقل مندی کی علامت ہے۔ سو یہ بات ثابت ہوئی کہ مجازی معنی مختلف لغات میں، مختلف ہو سکتے ہیں البتہ یہ بات خاصی دلچسپ ہے کہ اصطلاحی معنی، لغوی معنی کی طرح ہمیشہ ایک سے رہتے ہیں۔ مختلف علوم کے ماہر، خواہ کسی بھی خطے میں رہتے ہوں، اصطلاحی معنی میں تغیر نہیں آنے دیتے۔ اس بات کو مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ انگریزی لفظ سٹوری (Story) کا مطلب ہے کہانی لیکن اہل صحافت جب آپس میں گفتگو کریں گے تو وہ اس سے مراد کوئی نئی خبر لیں گے۔ انگریزی ترکیب سٹاپ پریس (Stop press) کا لفظی مطلب ہے۔ پریس کو روک دیں لیکن اہل صحافت کے نزدیک اس کا اصطلاحی مطلب ہے تازہ ترین خبر جو چھپنے کے لیے اُس وقت آتی ہے جب کاپی پریس میں جا چکی ہوتی ہے۔ اسی لیے عام طور پر ہمارے اُردو اور انگریزی اخبارات رات کے پچھلے پہر موصول ہونے والی تازہ ترین خبر پیشانی کے ساتھ ہی چھاپتے ہیں اور اس کے شروع میں جلی حروف میں سٹاپ پریس کے الفاظ لکھتے ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا نے سٹاپ پریس کی جگہ بریکنگ نیوز کی اصطلاح متعارف کرائی ہے۔ جونہی کسی چینل کو کوئی تازہ خبر موصول ہوتی ہے، جاری پروگرام کو روک کر بریکنگ نیوز کی سلائیڈ چلانے کے بعد وہ خبر ناظرین تک پہنچا دی جاتی ہے۔ بریکنگ نیوز ایک ایسی اصطلاح ہے جو اہل صحافت کے علاوہ عام آدمی کی سمجھ میں بھی آسانی سے آ جاتی ہے۔

اصطلاحات، عام طور پر ماہرین علوم کی وضع کردہ ہوتی ہیں اور انہی کی سمجھ میں آتی ہیں لیکن اگر اصطلاح آسان ہو اور اگر اسے بار بار استعمال کیا جائے تو اس کے اصطلاحی معنی عام لوگوں کی سمجھ میں بھی آنے لگتے ہیں۔ بیش تر اصطلاحات عام طور پر مشکل ہوتی ہیں لیکن ان کا بار بار استعمال انہیں آسان اور قابل قبول بنا دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اصطلاحی معنی کی درست تفہیم، ماہرین علوم ہی کر سکتے ہیں۔

اصطلاح سازی کے معاملے میں یہ بات اہم ہے کہ اصطلاح چاہے گرائمر یا قواعد زبان کے اعتبار سے غلط ہی ہو جب ایک خاص معنی میں استعمال ہونے لگتی ہے تو پھر اُسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا اگر ہم اسے تبدیل کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ مضحکہ خیز ہو جائے گی۔ مثلاً اگر ہم اُردو اخبار میں کام کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر اصطلاح اُردو ہی میں چھپے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم سٹاپ پریس کی جگہ "چھاپا خانہ روک دو" لکھیں گے تو خاصی مضحکہ خیز صورت حال بن جائے گی۔ اس لیے علماء اس بات پر متفق ہیں اصطلاح کو اس کی بنیادی شکل ہی میں رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔ اگر کسی اصطلاح کو ہم اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کے آرزومند ہوں تو پھر اس میں بہت محتاط ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے لفظ عام فہم ہو۔ ایسا ہو جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ بار بار استعمال کیا جائے تاکہ سماعتیں اس سے مانوس ہو جائیں۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض ٹی وی چینلز نے بریکنگ نیوز کا اُردو ترجمہ "تازہ ترین" کیا ہے۔ یہ ترجمہ چل نکلا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ترجمہ لفظی نہیں، بلکہ بامحاورہ ہے۔ اصل مفہوم کو ترجمے میں سمو دیا گیا ہے۔ اگر کسی اصطلاح کو اپنانے کے لیے ہم اس کا لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کریں گے تو ناکامی ہمارا منہ چڑائے گی۔

Scanned with CamScanner

مثلاً لاوڈ سپیکر کو جب اُردو میں آلۂ مکبر الصوت کہا گیا تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ ایک ان پڑھ آدمی بھی لاوڈ سپیکر کا مطلب جانتا ہے لیکن ایک پڑھے لکھے شخص کو بھی شاید یہ معلوم نہ ہو کہ آلۂ مکبر الصوت کا کیا مطلب ہے۔ اسی طرح موبائل فون کو کس نے گشتی فون لکھا تو اس پر ذم کا الزام دھر دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ موبائل فون کا یہ ترجمہ ٹھس ہو کر رہ گیا۔

ان دنوں بہت سی اصطلاحات شتر گربگی کا شکار ہیں۔ ہندی اور عربی، فارسی الفاظ کو جوڑ کر اصطلاحات وضع کی جا رہی ہیں۔ اہل علم اس پر خواہ دل ہی دل میں کڑھتے رہیں لیکن یہ اصطلاحات اب مروّج ہو چکی ہیں۔ اب اگر ان کو درست کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ شاید کامیاب نہ ہو مثلاً ''دھماکا خیز'' کی اصطلاح اب کثرت سے استعمال کی جا رہی ہے۔ حالانکہ اسے آتش خیز کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ''دھمکی آمیز'' کو تہدید آمیز کہا جا سکتا ہے۔ لیکن دھمکی آمیز کی ترکیب اس قدر عام ہو چکی ہے کے تہدید آمیز کو پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں سمجھ پائیں گے۔

اصطلاح سازی کے عمل میں ہمیں یہ بات بھی اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس زبان سے علم ہمارے ہاں آئے گا، اسی زبان میں اس کی اصطلاحات بھی آئیں گی۔ ہم اپنی زبان کی محبت میں یا دوسری زبان سے تعصب کے پیش نظر ان اصطلاحات کو بدلنے کی کوشش کریں گے تو متعلقہ علم کا سارا نظام دھڑام سے زمین پر ڈھے جائے گا۔

مثال کے طور پر علم عروض، عربی زبان سے اُردو ہی آیا ہے۔ اب اگر ہم بحروں کے نام عربی سے اُردو میں کرنے لگ جائیں تو صورت حال مضحکہ خیز ہو جائے گی۔ اسی طرح علم بیان اور علم بدیع کی ساری اصطلاحات عربی میں ہیں۔ ہم انہیں کسی بھی طرح اُردو نہیں ڈھال سکتے۔ تشبیہ کو ہمیشہ تشبیہ ہی کہیں گے۔ تلمیح کے لیے ہم کوئی اور لفظ استعمال کرنے کا سوچ بھی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح صنعت حسن تعلیل کے لیے ہمارے پاس کوئی متبادل لفظ نہیں۔ صنعت لف ونشر کو ہم اپنی مقامی زبان میں کیا کہیں گے؟ گویا یہ بات ثابت ہو گئی کہ جو علم پہلی بار جس زبان میں رواج پاتا ہے اسی زبان میں اس کی اصطلاحات عام ہو جاتی ہیں۔ وہ اسی زبان میں دوسری زبان کے ماہرین علوم کو بھی قبول کرنا پڑتی ہیں۔

اصطلاح کا دائرہ کیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو اپنے اندر بہت سے جوابات اور وضاحتیں لیے ہوئے ہے۔ اصطلاح کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ بہت سی تفصیلات وتشریحات کو ایک یا دو لفظوں میں سمیٹ لیتی ہے۔ یہ دریا کو کوزے میں بند کر دیتی ہے۔ بقول غالب اصطلاح دراصل گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتی ہے جب ہم اصطلاح کی پرتیں کھولنے لگتے ہیں تو پیاز کی طرح اس کے چھلکے اترتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کسی ویب سائٹ کی طرح ہمیں نئی سے نئی دنیا میں لے جاتی ہے۔ مثلاً جب ہم صنائع لفظی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس میں وہ ساری صنعتیں آ جاتی ہیں جو شعرائے کرام لفظوں کے استعمال پر اپنی قدرت کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جب ہم کسی ایک صنعت کا نام لیتے ہیں تو پھر آگے اس کی قسموں کا بیان آتا ہے۔ مثلاً اگر آپ صنعت تجنیس کا ذکر کرتے ہیں تو ساتھ ہی

Scanned with CamScanner

تجنیس نام، تجنیس مرکب اور تجنیس القلب کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ یوں معنی کا طلسم کھلتا چلا جاتا ہے۔

اسی طرح جب ہم صنائع معنوی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو یہ بھی ایک ویب سائٹ کی طرح ہم پر نئے جہانوں کے در وا کرتی ہے۔ اس میں بہت سی صنعتیں شامل ہیں اگر ہم ایک صنعت لف ونشر کا ذکر کریں تو اس کی اقسام، لف ونشر مرتب، لف ونشر غیر مرتب اور لف ونشر معکوس کا ذکر بھی لازم ہو جاتا ہے۔

گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصطلاح دراصل ایک گولی (Tablet) کی طرح ہوتی ہے جو اپنے اندر سینکڑوں قسم کی جڑی بوٹیوں کا اثر رکھتی ہے۔ اصطلاح اپنے اندر تلمیح کا سا لطف رکھتی ہے۔ جس طرح تلمیح کے ذریعے شاعر ایک یا دو لفظ استعمال کر کے بہت سے نقطے بیان کر دیتا ہے۔ اسی طرح ماہرین علوم ایک اصطلاح استعمال کر کے دراصل کفایت لفظی کا اظہار کرتے ہیں۔ اصطلاح طے شدہ مفاہیم کو بیان کرتی ہے۔ اصطلاحات دراصل ہمارا بہت سا وقت بچاتی ہیں اگر علماء اصطلاحات کا استعمال ترک کر دیں تو شاید انہیں نئی اصطلاحات وضع کرنے کے لیے غور وفکر کا موقع ہی نہ ملے۔

جہاں تک ہماری ادبی اصطلاحات کا تعلق ہے یہ بیشتر وجود پا چکی ہیں لیکن جوں جوں اہل ادب نئے تجربات کر رہے ہیں توں توں بہت سی نئی اصطلاحات بھی وجود میں آ رہی ہیں۔ مثلاً نثم، نظمانہ، خماسی، ثلاثی، افسانہ، تحقید، وغیرہ۔ یہ اصطلاحات چونکہ فی الحال انفرادی سطح پر استعمال ہو رہی ہیں اسی لیے کچھ زیادہ رواج نہیں پا سکیں۔

یوں تو شاعری کی بہت سی اصطلاحات عام ہیں لیکن اس وقت جو زیادہ مستعمل ہیں ان میں آمد، آورد، فرد، شعر، بیت، ردیف، قافیہ، مطلع، مقطع، حسن مطلع، مطلع ثانی اصلاح معروض، بحر، وزن، بحور، اوزان، نظم، نظم آزاد، پابند نظم، نظم معریٰ، نثری نظم، غزل، قطعہ، مرثیہ، قصیدہ، تشبیب، چہرہ، غزل مسلسل، کلیات ہجو، شیر آشوب، مثنوی، مثلث، رباعی، دوبا، ماہیا، مخمس، مسدس، دیوان، مسمط، مثمن، ترکیب بند، ترجیع بند، تلمیح، مقفیٰ مردّف، غیر مردّف غیر مقفیٰ، مکرر، تکرار لفظی، شتر گربہ، پہلوئے ذم، عیب تنافر، عیوب شعر، محاسن شعری، تقطیع، بے وزن، سکتہ، تشبیہ، استعارہ، ضائع بدائع، لف ونشر، تجنیس، صنعت تعطیل، صنعت ایہام، ترنم، مترنم، مصرع، غنائیت، موسیقیت، تحت اللفظ، سہیل ممتنع، صنف سخن نمایاں ہیں۔

اسی طرح نثر کے حوالے سے جو ادبی اصطلاحات آج مستعمل ہیں ان میں داستان، افسانہ، ناول، افسانچہ، ڈراما، تنقید، نقاد، محقق، تحقید، نظلمانہ، داذیت، خارجیت، فصاحت، بلاغت، ابلاغ، آفاقیت، مقفیٰ مسجع، حقیقت نگاری، رومانیت، قنوطیت، تنوع، مشابہت پسندی، ترقی پسندی، قدامت پسندی، کلاسیکت، مضمون، انشائیہ، مقدمہ، تقریظ، دیباچہ، فلیپ، تذکرہ، تاریخ اصلاح زبان، ارتقاء حیات وفن، مقالہ، مکتوب، مکاتیب، تحریک، مباحث، ادب، سخن، مطالعہ، مشاہدہ، نگارش، انشا پرداز، مزاح نگاری، کتاب، مجموعہ نمایاں ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات متعین مفہوم کے ساتھ اہل ادب استعمال کر رہے ہیں اور تا حال ان میں بہت سے افسانے بھی ممکن دکھائی دے رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

انشائیہ

کچھ محبت کے بارے میں

سید مشکور حسین یاد

محبت ایک ایسا موضوع ہے کہ جس کے بارے میں ہر قاری کچھ نہ کچھ پڑھنا اور سننا چاہتا ہے۔ اسی طرح ہر لکھنے والا محبت کے بارے میں کچھ پڑھانا اور سنانا بھی چاہتا ہے اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ محبت کرنے والوں کی کوئی کمی بھی نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے کہ محبت کرنے والے اپنی محبت کے بارے میں کچھ بتانے کی خواہش کے باوجود کچھ بتا نہیں پاتے۔ محبت کو ہم چھپانا بھی چاہتے ہیں۔ ہم محبت کے بارے میں بتانا اس لئے چاہتے ہیں تا کہ دوسرے لوگوں کو پتا چلے کہ ہم بھی محبت کرتے ہیں، ہم بھی اپنے علاوہ دوسرے لوگوں کو چاہتے ان کو پسند کرتے ہیں لیکن ہم اپنی محبت چھپاتے اس لئے ہیں تا کہ دوسرے لوگ ہمیں یہ نہ کہیں کہ جن سے آپ محبت کرتے ہیں وہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کو سنبھالے بغیر بھی بات نہیں بنتی اور جس کو ہزار سنبھالنے کے باوجود سنبھالا بھی نہیں جاتا۔ اصل میں محبت کے اظہار میں یہ خرابی ہے کہ دوسرے لوگ ہمیں محدود سمجھنے لگتے ہیں۔ گویا اگر ہم ایک سے محبت کرتے ہیں تو دوسرے سے کیسے محبت کر سکتے ہیں..... حالانکہ ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ محبت کا جذبہ کوئی محدود جذبہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہم اسے محدود کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔ وہی بات کہ ہم دوسروں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میاں ہم صرف آپ سے محبت کرتے ہیں دوسروں سے نہیں..... کیوں؟ اس لئے آپ جیسے دوسرے لوگ نہیں ہیں..... گویا محبت انسان کو یکتا یگانا رکھنا چاہتی ہے۔

یہاں ایک اور خرابی یہ ہے کہ محبت انسان کو یگانا اور یکتا تو رکھنا چاہتی ہے لیکن وہ اپنی اس یکتائی اور یگانگت کو عام بھی کرنا نہیں چاہتی ہے۔ محبت کو عام نہ کرنے کی وجہ سے اور تو کچھ نہیں ہوتا محبت خصوصیت کے ساتھ عام ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ انسان کے پاس محبت واحد ایک ایسا جذبہ ہے جس کو آدمی جس شدت سے چھپانا چاہتا ہے وہ اسی شدت سے منظر عام پر آنے کی جرأت بھی کرتی ہے۔ اگر آدمی اس جذبہ کو چھپانا نہ چاہے یا اس سے بلند ہو جائے کہ یہ جذبہ چھپتا ہے یا نہیں چھپتا تو پھر یہ جذبہ خود مختار ہو کر چھپنے میں بھی ایک حسن پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور اسی طرح ظاہر ہونے میں بھی اس کے حسن کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

Scanned with CamScanner

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو ابھی تک محبت کرنی نہیں آئی۔ وہ اس ضمن میں افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر انسان اپنی محبت کو سنبھال سکے میرے کہنے کا مطلب ہے مجموعی اعتبار سے اگر انسان اپنی محبت کو سنبھال سکے تو پھر ایک مثالی معاشرہ کی داغ بیل آسانی کے ساتھ پڑنے لگتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان ازل سے آج تک اپنی طرف سے کوشش میں مصروف ہے کہ اسے محبت کرنی آ جائے۔ لیکن یہی بات کہ محبت کا جذبہ اپنی جگہ اس قدر نازک جذبہ ہے کہ انسان کسی نہ کسی انداز سے کوتاہی کا شکار ہو جاتا ہے اور محبت اس کے ہاتھ سے نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے.....اور انسان کے ہاتھ سے محبت کا نکلنا اپنی جگہ اس قدر تکلیف دہ ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ....واحد اس کا حل یہی ہے کہ انسان محبت کے جذبہ کو بہت عقل و حکمت کے ساتھ تجربہ میں لائے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ محبت کے جذبہ کو عقل و حکمت سے اپنے تجربہ میں لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہاں آ کر انسان کو پھر اپنے تمام حواس کو بروئے میں لانا پڑتا ہے لیکن محبت کا جذبہ انسان کو یہ احساس بھی دلاتا رہتا ہے کہ بھائی کوشش جاری رکھو ایک دن تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

مطلب یہ ہے کہ محبت انسان کو مایوس نہیں کرتی بلکہ حوصلہ بڑھاتی ہے۔

☆ ادارے کا رسالے میں شائع ہونے والی تحریروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆ رسالے میں شائع ہونے کے لیے تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے۔

☆ شائع ہونے کے لیے ارسال کی جانے والی تخلیقات صفحے کے ایک طرف لکھی ہوں اور خوشخط ہوں۔

☆ تخلیقات کی فوٹو کاپی لکھاری اپنے پاس رکھیں اور اصل مسودہ ادارے کو ارسال کریں۔

☆ نمود کو برائے اشاعت ارسال کی گئی تخلیقات کو کسی اور رسالے کو نہ بھجوایا جائے، ذرا صبر سے کام لیا جائے۔

Scanned with CamScanner

روحی کنجاہی

غزل

روز کہتا ہے صاف رنگ شفق
بہہ رہا ہے زمیں پہ خوں ناحق
کیسا منظر نگاہ سے گزرا
ہو گیا کیوں مرا کلیجہ شق
کربلا سے گزرنا ہو گا اسے
جو بھی ہو گا مسافرِ رہ حق
عشق کا فلسفہ ہے اپنا ہی
کام آتی نہیں کوئی منطق
کام آتا نہیں ہے رٹنا بھی
بھول جاتا ہوں روز تازہ سبق
کس کرن کا کرشمہ ہے آخر
ہو گئے روشن اپنے چودہ طبق
اتنی آسان زندگی ہے کہاں
سارے کا سارا ہے نصاب ادق
بات ایسی نہیں خبر میں تو پھر
ہو گیا رنگِ شہر کس لئے فق
سامنے ہے لہو لہو تاریخ
کتنا رنگیں ہے ایک ایک ورق
میں کسی کام آ سکا نہ کبھی
اس کا روحی مجھے رہے گا قلق
کیسا پیغام تھا خدا جانے
کن کے روحی ہوا ہے جاں بحق

غزل

کیا ہونے جا رہا ہے جو بھی جانتا ہے سب
جی چاہتا ہے پوچھوں اسی سے بصد ادب
کچھ تو ہے اپنی اپنی خموشی کا بھی سبب
ورنہ زباں ہے کانٹوں کی تو پھولوں کے بھی لب
انسانی نفسیات کی ہلکی سی ہے جھلک
جتنا بھی سامنے ہے عظیم عالمی ادب
آمادہ صلح پر کوئی ہوتا نہیں یونہی
روٹھا ہے جب بھی روٹھا ہے البتہ بے سبب
اب اس کمی کو کوئی کرے پورا کس طرح
سب کچھ ملا پہ وہ نہ ملا جس کی تھی طلب
ایک آدھ سے ہی میں تو بمشکل ہوں آشنا
جینے کے ہوں گے ہونے کو کتنے ہی اور ڈھب
دنیا کی کتنی دوریوں کا خاتمہ ہوا
دیکھیں سمیٹے فاصلے انساں دلوں کے کب
جن کے لئے گزر گئے ہم قلب وجان سے
آیا انہیں خیال ہمارا نہ تب نہ اب
آئے سمجھ میں کچھ تو، ہمیں بھی بتایئے
جینے کی وجہ کیا ہے تو مرنے کا کیا سبب
ہر شخص بارے سوچتے رہنے کا تک ہے کیا
اچھا بُرا ہے کتنا تو کتنا عجب عجب
روحی گزر گئی ہے یونہی کتنی زندگی
یونہی گزارتے ہیں ابھی کتنے روز و شب

Scanned with CamScanner

سلیم الرحمٰن

غزل

ہر زخم اپنی اپنی جگہ پر ہرا رہا
پرسا نگین صبر لبالب بھرا رہا
کچھ تلخیٔ حیات کو اُس نے سوا کیا
کچھ یوں بھی زندگی کا مزہ کرکرا رہا
قصہ دل حزیں کا بڑا مختصر سا ہے
زندہ بڑا ہی کم رہا زیادہ مرا رہا
یادوں کا اک چراغ جلایا تھا جو کبھی
محراب جاں پہ دیر تک روشن دھرا رہا
کیوں یہ مکان جان کا ڈھنڈار ہو گیا
کس کی جگہ یہاں پہ کوئی دوسرا رہا
اک راج کرا کا سدولانے دیر تک سلیم
سکہ وہی نہ چل سکا جو کہ کھرا رہا

غزل

ایک نوحہ بن رہا ہے دیدۂ تریاد کا
اب ہمہ تن گوش ہو کر شورسن فریاد کا
دیکھ ٹھاٹھیں مارتا ہے اک سمندر یاد کا
دیدنی منظر ہوا ہے اب میرے گھر یاد کا
اے مسیحائے زماں کوئی تو مرہم بھیج ہے
دیکھ رسنے لگ پڑا ہے زخم ہر ہر یاد کا
درس نسیاں جس قدر کہ حفظ کرنے کو کہا
اُس قدر قصہ سنایا اُس نے فرفریاد کا
اے ہوئی درد ہجراں اے غنیم جسم وجاں
تو نے شعلہ ہی بنا ڈالا ہے اخگریاد کا
تیر جی کے زہر میں بجھ ہی گئی جب زندگی
کیوں سرِ افلاک دل نکلا ہے اختر یاد کا
کس نے ساکت جھیل کو مائل بہ حرکت کردیا
کس نے میرے سر پہ مارا ایک پتھر یاد کا
پھر جواں ہونے لگا ہے عزم اڑنے کا سلیم
پھر نکالا طائرِ بسمل نے اک پر یاد کا

Scanned with CamScanner

غزل

باب حیرت عجب کھلا مجھ میں
تھی مجھ میں تھا آئینہ مجھ میں
بھرتی رہتی تھی جس کو تنہائی
ہجر تھا یا کوئی خلا مجھ میں
ہے کوئی خامشی الگ سی کہیں
اور اک شور ہے جدا مجھ میں
وقفے وقفے سے جگمگاتا ہے
اک ستارہ سا جا بجا مجھ میں
مجھ سے ٹکرا کے لوٹ جاتی ہے
آ کے رکتی نہیں صدا مجھ میں
خود کو آزاد کرنے والا تھا
پھر کوئی چیخنے لگا مجھ میں
پھر کوئی آفتاب شعلہ جبیں
دن ڈھلے ڈوبنے لگا مجھ میں
بٹ رہا تھا میرا وجود آصفؔ
ہو رہا تھا کوئی جدا مجھ میں

غزل

کبھی میں ترے سپنوں کی رانی بادشاہا
ترے دل پر تھی میری راجدھانی بادشاہا
اسے تیری رعایا اپنے خوں سے لکھ رہی ہے
تجھے سننی پڑے گی یہ کہانی بادشاہا
بہت کڑوے کسیلے ذائقے ہیں زندگی کے
بہت میٹھا ترے چشموں کا پانی بادشاہا
ترے عشرت کدوں کو کیا خبر ہوتی ہے کیسی
یہ تنہائی، یہ کنج رائیگانی بادشاہا
محبت کے لیے کب کس نے تاج و تخت چھوڑا
یہ ساری بادشاہوں کی کہانی بادشاہا
کبھی سوچا ہے کن آنکھوں سے بہتا آرہا ہے
ترے محلوں کا یہ شفاف پانی بادشاہا
تری شاہی تری فوجیں ترے باغات قلعے
میرا کیا میں تری خلعت پرانی بادشاہا
میرے اندر یہ کیسا خوف تیری سلطنت کا
تیرے اندر یہ کیسی بدگمانی بادشاہا
تیری سطوت کو یہ اک روز خاکستر نہ کردے
کڑکتی ہے جو بجلی آسمانی بادشاہا
دلِ ناداں سے لبنیٰ کہہ رہی ہوں یہ محبت
کہانی ہے کہانی ہے کہانی بادشاہا

Scanned with CamScanner

غزل

(نذر مجید امجد)

ہیں شاخِ یاد پہ نکہت فشاں گلاب کے پھول
کہ زخم دل کے ہیں، الفت نشاں گلاب کے پھول

روش روش پہ، وہ یادوں کے پھول مہکے ہیں
وہ نقشِ پا ہیں کہ اَرغواں گلاب کے پھول

بساطِ خاک پہ رکھا ہے کیوں تضاد کا رنگ
یہاں جو خون کے چھینٹے، وہاں گلاب کے پھول

اِک ایسی فصلِ بہاراں نصیب ہے ہم کو
برستی آگ میں نوحہ کناں گلاب کے پھول

سحابؔ! بات جو لفظوں سے ہو نہ سکتی ہو
تو ایسی بات کو دیں گے زباں گلاب کے پھول

☆.....☆☆☆.....☆

غزل

بلا سبب تو دلوں میں غبار تھوڑی ہے
یہاں خوشی سے کوئی اشکبار تھوڑی ہے

ہم ایک مملکتِ بے سند میں رہتے ہیں
ہمارا جینا کوئی افتخار تھوڑی ہے

ہوئی تھی اس سے ملاقات تو سرِ راہے
اس اجنبی کا مجھے انتظار تھوڑی ہے

سبھی نے بیچا ہے یاں غیرت و حمیت کو
یہاں کوئی بھی مگر شرمسار تھوڑی ہے

خزاں رسیدہ چمن میں ہواؤں کا چلنا
نویدِ آمدِ فصلِ بہار تھوڑی ہے

یہ اور بات شریکِ سفر ہے وہ میرا
میری طرح سے مگر سوگوار تھوڑی ہے

یہ بے قراری تو عادت سی ہو گئی ہے اب
یہ دل کسی کے لیے بے قرار تھوڑی ہے

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو چاہتے ہیں ہم
کہ اپنے دل پہ ہمیں اختیار تھوڑی ہے

خلوص رکھتے ہیں دل میں ندیمؔ سب کے لیے
مگر کسی پہ ہمیں اعتبار تھوڑی ہے

Scanned with CamScanner

ظہور احمد

غزل

گفتگو میں کبھی صبح تک جاگنا، چائے خانوں میں باغوں میں شب کاٹنا
شعر کی دھن میں محفل سے یوں بھاگنا گفتگو کو بطرزِ عجب کاٹنا

برق رفتاریاں اُن کی ماضی ہوئیں ایک لیزی سے لو پہ نہ راضی ہوئیں
یاد ہیں وہ شروع دن کی سرمستیاں وہ عجب دیکھنا وہ غضب کاٹنا

ان بھلی مانسوں کا کہاں بس چلے، بے وفاؤں سے خود ہی خدا سمجھ لے
ان کے بس میں تو اتنا ہے روتی رہیں، خامشی سے کبھی اپنے لب کاٹنا

تم نے بولا ہمیشہ نہیں آؤ گے ہم نے سمجھا کہ شاید چلے آؤ گے
جانتے تھے یہ امید کی موت ہے، ہو گا مشکل بہت بے سبب کاٹنا

ہم جو ڈٹ جائیں گے تو بچیں گے تبھی ورنہ چن چن کے وہ ماردیں گے ہمیں
ہاتھ مل جائیں گے تو بہت زور ہے، ہو گا مشکل بہت سب کے سب کاٹنا

میرے ساتھی مرے بھائی چلتے ہیں اب ہم ملیں گے مدینے کی گلزار میں
تھوڑا رستے میں ٹھہریں گے غارِ حرا میرے بستر پہ تم آج شب کاٹنا

☆.....☆☆☆.....☆

ڈاکٹر لبنیٰ آصف

غزل

یہ کربلا ہے اور یہی صحرائے عشق ہے
اے عقل سجدہ ریز ہو یہ جائے عشق ہے

کس درجہ دل گداز یہ دنیائے عشق ہے
"ارض و سما میں شورش و غوغائے عشق ہے"

ہم نے بھی اپنی جاں کو ہتھیلی پہ رکھ لیا
یہ سوچ کر کہ اب یہ تقاضائے عشق ہے

کچا گھڑا نصیب میں لکھا ہے یا نہیں
رستے میں آج بھی وہی دریائے عشق ہے

پوچھیں گے ہم بھی لوٹ کر آئے اگر کوئی
وسعت میں کتنی دور تک صحرائے عشق ہے

سرشاریء وجود میں اپنی خبر کہاں
لبنیٰ عجیب مستیء سودائے عشق ہے

☆.....☆☆☆.....☆

محمد علی ظاہر

غزل

جتنے بھی حُسن یاب تھے شہرِ بدن میں کھو رہے
ہم سے نظر کشیدگاں بسترِ شب پہ سو رہے

رقص کناں تھی چاندنی جھیل کنارے ریت پر
ایک نوا کے پھول تھے پانی میں عکس بو رہے

دید کا آشیاں ابھی پوری طرح بنا نہ تھا
وائے پرندگانِ شام شاخِ مژہ بھگو رہے

شہرِ خطا کے اور بھی کتنے عذاب ہیں ابھی
اور ہم اک صدی سے ہیں بارِ ضمیر ڈھو رہے

یارا! یہ خانقاہ ہے کوئی سرا کدہ نہیں
جانے پہ کچھ غبن نہیں رہنا ہو جس کو، سو رہے

غزل

آنکھ میں کچھ ایسا منظر آ گیا
عکس آئینے سے باہر آ گیا

دل نے چاہی اک نشانی یاد کی
اور گمٹی پر کبوتر آ گیا

آج اُس نے آنکھ بھر دیکھا مجھے
آج اِس دیوار میں در آ گیا

تو مجھے باہر سے ہی تکتا رہا
میں ترے اندر سے ہو کر آ گیا

وقت کی رفتار میں لرزش ہوئی
ہجر کا لمحہ مکرر آ گیا

(محمد علی ظاہر، سیال ہاؤس، ندیم سٹریٹ، سمن آباد، ٹوبہ
روڈ، جھنگ صدر
(03057119272

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر نبیل احمد نبیلؔ

غزل

کہیں پہ اشک، کہیں چشم تر بناتا ہوں
میں اپنی موج میں رہ کر بھنور بناتا ہوں
پھر اس کی لو سے نکلتا ہے اک نیا سورج
تمھارا چہرہ دِیے پر اگر بناتا ہوں
یہی حوالہ مرا معتبر حوالہ ہے
میں سارے نام ترے نام پر بناتا ہوں
مرے لیے مری پہچان جو بھی بن جائے
میں شاعری میں اک ایسی ڈگر بناتا ہوں
میں اپنے ڈھب سے بناتا ہوں تیری دنیا کو
سو بار بار اسے توڑ کر بناتا ہوں
پھر اس کے بعد ہوا بھی بجھا سکے نہ چراغ
میں تیرگی سے اک ایسی سحر بناتا ہوں
میں چاہتا ہوں مرے ساتھ وہ کرے باتیں
کسی طرح تری تصویر اگر بناتا ہوں
بگاڑ لیتا ہے میرے تمام خال و خد
وہ آئنہ میں جسے توڑ کر بناتا ہوں
مہکنے لگتا ہے آنگن عجیب خوشبو سے
فصیل پر تری تصویر اگر بناتا ہوں
بنانا چاہوں تجھے پھر غزل کی صورت میں
میں کچھ بنا نہیں سکتا مگر بناتا ہوں
پھر اُس کے بعد وہی ہم کلام ہوتی ہے
وہ اِک نظر جسے دیوار پر بناتا ہوں
قدم قدم پہ جہاں رنجِ رایگانی ہو
میں اُس سفر کو بہت مختصر بناتا ہوں
مجھے خبر ہے اُسے پھر سے مٹ ہی جانا ہے
وہ ایک نقش جو بارِ دِگر بناتا ہوں
اُسے یہ ضد ہے کوئی خُوب تر نہیں اُس سے
مجھے یہ زعم کہ میں خُوب تر بناتا ہوں
عجیب شخص ہوں کیا سوچ کر بناتا ہوں
میں خشکیوں پہ بھی پانی کے گھر بناتا ہوں
ترے بنائے پہ کرتا ہوں اعتبار مگر
کبھی کبھی اسے بارِ دِگر بناتا ہوں
مرے لیے یہ اگاتی ہے گوہرِ گندم
میں ارضِ پاک کے ذروں کو زر بناتا ہوں
میں تیرے ساتھ اُٹھاتا ہوں اِس لیے بھی ہاتھ
کہ ہاتھ اُٹھا کے دُعا میں اثر بناتا ہوں
مجھے جو بخشے دوام اِس قدر زمانے میں
میں اپنے عشق کو ایسی خبر بناتا ہوں
میں چاہتا ہوں کسی دشت کو کروں آباد
ترے نگر سے پرے ایک گھر بناتا ہوں
پھر اُس کے بعد کوئی راستہ نکل آئے
میں پانیوں سے اُدھر ایک در بناتا ہوں
رہے یہ عشق سلامت کچھ اِس لیے بھی میاں
میں اپنے آپ کو مضبوط تر بناتا ہوں
قدم قدم چلا آتا ہوں روز و شب جو یہاں
ترے نگر میں نئی رہ گزر بناتا ہوں
رہِ حیات کے تپتے ہوئے سفر میں بھی
میں اپنے جسم کو اکثر شجر بناتا ہوں
مجھے وہ کرتا ہے مسمار صبح و شام نبیلؔ
میں اپنے آپ کو شام و سحر بناتا ہوں

☆.....☆☆☆.....☆

قائم نقوی

غزل

کئی ماہ و سال گزر گئے
جو بنے تھے خواب بکھر گئے

تیرے ہجر تیرے وصال میں
کبھی جی اٹھے کبھی مر گئے

تیری بات پہ کبھی ہنس دیئے
کبھی اشک آنکھ میں بھر گئے

اب رہا ہوا تو کروں گا کیا
میرے بال و پر جو اُتر گئے

وہ توانا پختہ سے لوگ تھے
میری خستگی سے جو ڈر گئے

جنہیں ساحلوں نے رہا کیا
وہ سمندروں میں اُتر گئے

Scanned with CamScanner

سلیم الرحمٰن

کمل داس گپتا.....ایک بلند پایہ اور صاحب اسلوب موسیقار

بڑے بوڑھوں سے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ بنگال کو اللہ پاک نے آنکھیں، بال اور گلا تینوں ہی چیزیں نہایت سُریلی اور قابل رشک عطا کی ہیں۔ کئی سال بیت گئے (غالباً 1994ء) ایک مرتبہ صلاح الدین محمود صاحب کی خدمت میں اپنے ایک دوست عزیزم ندیم بٹ کے ہمراہ حاضر ہوا۔ صلاح الدین محمود صاحب کی کتب کی اور میوزک کی لائبریری بہت خوب تھی۔ بڑی ہی لذید کافی سے انہوں نے تواضع کی۔ محمد سلیم الرحمٰن صاحب کا کچھ عرصے کے لیے بڑا بھرپور اور جاندار تذکرہ ہوا وہ ایک زمانے میں اُن کے کلاس فیلو بھی رہے تھے۔ پھر سامنے بڑے ہی قرینے اور سلیقے سے رکھے ہوئے مختلف L.P پر نظر پڑی اور ہماری طرف دیکھ کر گویا ہوئے۔ ''آپ کیا سننا چاہیں گے میں نے فوراً کہا۔'' کانن بالا سنوا دیجیے'' چونک اُٹھے اور بڑی ہی حیرت آمیز مسرت اپنی مشفق آنکھیں میری طرف کیں۔ فرمایا: ''ارے.....!.....کانن بالا سنیں گے پھر تو ہمارے ساتھ آپ کا خونی رشتہ قائم ہوگیا۔ چند ہی لمحوں بعد کمرے کی خوبصورت فضا میں کانن بالا کی سُریلی اور مسحور کن آواز تیرنے لگی۔

اے چاند چھپ نہ جانا

فلم ''جواب'' کا نغمہ تھا کانن بالا (کانن دیوی) کا بنگالی رس بھرا پرسوز گلا اور گلے کی چمک کے پس منظر میں کمل داس گپتا کی طرز کی دمک۔ گویا روح روشن ہوتی چلی گئی۔

بنگال کے اس ساحر نے اپنی طرز سازیوں میں کیا کیا سحر کاریاں کی ہوئی ہیں۔ اس کا اندازہ صرف وہی شائقین موسیقی کر سکتے ہیں جو کمل داگپتا کے فنی مقام و مرتبہ سے آگاہ ہیں اور جنہوں نے کملا جھریا۔ جوتیکا رائے، فیروز بیگم، کانن بالا کے وہ شاہکار نغمات سنیں ہوں جو کمل داس گپتا نے کمپوز کیے تھے۔ اور.....اور..... جگ موہن، ہیمنت کمار اور طلعت محمود کی غیر فلمی غزلیں اور غیر فلمی نغمات جن کے رگ جاں میں اتر چکے ہوں۔ ایسے شائقین موسیقی اور ایسے قدر دانوں سے پوچھئے کہ کمل داس گپتا کون تھا اور اپنی طرز سازی سے کیا کیا اور کیسا کیسا جادو بکھر گیا کہ جس کا جادو ستر برس گزر جانے کے بعد بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

کمل داس گپتا..... بنگالی جمال ریزی کی ایک ایسی خوبصورت مثال کہ رابندر اسنگیت اور نذر الاگیت جس پر ہر دو کو فخر ہے۔ خان صاحب اُستاد ضمر الدین خاں کے اس مایہ ناز شاگرد ارجمند نے جوتیکا۔ رائے کی منفرد، سُریلی اور دل گداز آواز میں جب یہ گانا ریکارڈ کیا۔

چپکے چپکے بول مینا

تو اس ریکارڈ کی مقبولیت نے گذشتہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے اور ایک لاکھ ریکارڈ کی سیل نے تب ایک نیا ریکارڈ قائم کیا اور جب گپتا جی نے گداز بنگال فیروزہ بیگم کی دردناک آواز میں یہ کہلوایا کہ

تم بھلائے نہ گئے ہائے بھلائے نہ گئے

تو صاحبان قلب ونظر اور دل زدوں کے ساتھ ساتھ دیواریں بھی گریہ کرنے لگیں جب سُر سُاگر جگ موہن (جنگ موئے مترا) نے اپنی دردناک آواز میں یہ کہا

دل کو ہے تم سے پیار کیوں
یہ نہ بتا سکوں گا میں

تو گپتا نے طرز سازی میں حزنیہ اور نشاطیہ تاثر کو یوں شیر شکر کر دیا کہ سننے والوں کے پاؤں میں زنجیر سی پڑ گئی۔

فیاض ہاشمی کے خوبصورت نغمات کو طلعت محمود، ہیمنت کمار، جگ موہن دل کی دل میں اتر جانے والی آوازوں کو اس صاحب اسلوب موسیقار نے اپنے خداداد فن اور تخلیقی ذہن سے یوں امر کر دیا کہ گویا بیسویں صدی عیسوی کے چوتھے حصے کے اواخر اور پانچویں دہائی کے آغاز کے چند سالوں میں بنگالی جادو خوب سر چڑھ کر بولا۔

اسی عرصے میں (1937-1953)ء بنگالی فنکاروں کی سُریلی راجدھانی سے ایک امر رہنے والی ایسی سُریلی عمارت تعمیر ہوئی کہ بے عدیل کہئے اس سُریلی عمارت کو ان پانچ ستونوں نے ایسا کمال و جمال عطا کیا کہ سبحان اللہ!

داس گپتا (یہ تینوں حقیقی بھائی تھے) پارول گھوش، کملا جھریا، اندو بالا، انگور بالا، کانن بالا جوتیکا رائے، فیروزہ بیگم، انیا داس گپتا، زہرہ بیگم کلکتے والی، پرتیما داس گپتا، اپتلا سین، سمتر ادیوی، کلیانی داس گپتا رائے متاخرین میں سے چند نام اور ملاحظہ کیجیے گا۔

بیو، بشیر احمد، فردوسی بیگم، شہناز بیگم، وینا لیلیٰ، رونا لیلیٰ۔

جگ موہن کی اثر انگیز اور سُریلی آواز میں آپ کو اگر کبھی یہ گیت یاد آئے تو اُس کی گائیکی (طرز راگنی جھنجھوٹی سے ماخوذ ہے) اور طرز آپ کی سماعت میں بھنور سا بنانے لگے تو آپ کے دل کا نوکا ضرور ہچکولے کھانے لگے گا۔

Scanned with CamScanner

تم میرے سامنے آیا نہ کرو
دل میں جو درد چھپائے ہوں میں
اُس کو رہ رہ کر بڑھایا نہ کرو

ایسی طرز اور ایسی ہی کئی طرزوں کے موجد و خالق ..... کمل داس گپتا ان کی تخلیقی شخصیت کا ایک دلچسپ منفرد اور Worthmentioning پہلو یہ ہے کہ اپنے معاصرین (سینئر معاجونیر) بلاشرکت غیرے وہ واحد موسیقار ہیں کہ جن کے غیر فلمی نغمات و غزلیات کو اُن کے فلمی نغمات کی نسبت کہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

اگر چہ اُن کی سوانح حیات کے حوالے سے (جس کا مختصر ترین خلاصہ آئندہ سطور میں مرقوم ہوگا) یہ کہنے میں کوئی ہرج نہیں کہ اُن کی سیہ بختی کی تاریکی میں اُن کے مذکور، تابناک پہلو میں کوئی دوسرا موسیقار اُن کا شریک نہیں۔

غیر فلمی نغمات کا (غزلیں نظمیں 1947ء 1941ء) اس قدر مقبول ہونا اور پھر فلموں کی بجائے صرف گرامون (فلم جواب اور فلم ہسپتال کو منہا کر کے) ریکارڈز کی طرز سازی پر بے پناہ مقبولیت بلاشبہ کمل داس گپتا ہی کا مقدر تھی۔ آپ نے کملا جھریا (چند ایک غزلیں) جوتھیکا رائے، کانن بالا فیروزہ بیگم اس طرح پنکج ملک، جگ موہن، ہیمنت کمار اور بالخصوص طلعت محمود ان تمام گلوکاروں اور گلوکاراؤں کی پُرسوز آوازوں پر سوز، موثر اور نا قابل فراموش غیر فلمی ریکارڈ سنیں ہو گئے۔ اگر نہیں سنے تو اس کے متوازی کملا جھریا (اگر ان کے لیے بنائی گئی کمپوزیشن کی تعداد بہت کم ہے جو تیکا رائے، کانن بالا اور فیروز بیگم نے بھی کمل داس گپتا کی طرزوں میں اپنی گائیکی کی روح سمودی اور مذکورہ بے مثل میوزک ڈائریکٹر کی پر گداز اور مؤثر طرزوں کا حق کما حقہ ادا کر دیا۔

اس وقت یعنی دم تحریر مری آنکھوں کے سامنے اس فطین میوزک ڈائریکٹر کی تصویر پڑی ہے اور کانوں میں طلعت محمود کی دلنشین آواز آرہی ہے۔

تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی

تصویر کی اس مجبوری کی تلافی یوں کرنا چاہتا ہوں کہ کمل داس گپتا کی زندگی کی کہانی اپنے قارئین محترم تک تصویر کے ساتھ ایک مرقع تحریر کے سہارے سے پہنچا دی جائے۔ مگر ..... مگر حد ادب! کہ بنگالی موسیقاروں اور بنگال کی سحر انگیز موسیقی کا ایک نہایت مختصر ترین اجمالی سا تذکرہ ہو جائے۔

یوں تو بنگال پر فنون لطیفہ کے حوالے سے سینکڑوں صفحات لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے بھی جا چکے ہوں گے بلکہ اسی حوالے سے ایک کتاب منظر عام پر آ سکتی ہے اور جب فنون لطیفہ میں بنگال کی موسیقی، یہاں کی گائیکی، بنگالی موسیقاروں سازندوں، میوزک ڈائریکٹرز، مغنیوں اور مغنیاؤں کا تذکرہ چھیڑے گا۔ (اطلاعاً عرض ہے کہ یہ تمام مذکورہ فنکار بیک وقت بنگالی اور اُردو ہر دو رزبانوں میں

اپنی سحر کاریاں دکھانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے) تو یہ تذکرہ بیسوؤں صفحات پر پھیلتا چلا جائے گا۔ فنون لطیفہ کی اگر دانستہ طور پر ایک زمانی حد مقرر کے اس پہلو کی کی جائے تو حقیقت یہ ہے کہ بات رابندر ناتھ ٹیگور سے شروع ہوگی اور قاضی نذر السلام سے ہوتی ہوئی اُستاد ضمیر الدین خاں کے تذکرے کو چھوتی ہوئی کئی نامور ہستیوں کو اپنے دریائے لطافت میں بہاتی چل جائے گی۔

اس دائرہ ذکر میں ایسے ایسے ذہین، فطین اور نابغۂ روزگار سامنے آئیں گے کہ شائقین و ماہرین زمزمہ سازی بے اختیار سبحان اللہ کہہ اُٹھیں گے۔ سردست اس میدان کے بہت سے اہم نام (موسیقار، مغنی، مغنیہ) سپرد قلم کر رہا ہوں۔

آر، سی بورال انل بسواس، ایس ڈی برمن تحریر ن، است برن، پنکج ملک، جگ موہن مترا، ہیمنت کمار، سلیل چودھری، کے سی ڈے، مناڈے، اشوک کمار، کشور کمار، بمل داس گپتا، کمل داس گپتا، سبل، براہ کرم ضرور سنئے گا اور پھر کمل داس گپتا جی کے مقام و مرتبے کا تعین آپ از روئے انصاف ہو پائے گا۔ آج بھی نغمات یعنی غیر فلمی گراموفون ریکارڈ بج رہے ہوں تو کون کون رسیا ایسا ہوگا کہ جس پر خاص قلبی کیفیت طاری نہ ہوگی اور وہ دوران سماعت یہ تخیلاتی طور کہیں کا کہیں نہ پہنچ جائے گا۔

کمل داس گپتا..... 28 جولائی 1912ء میں بنگلہ دیش کے شہر جیسور کی قربت میں واقع قصبہ کالیہ میں پیدا ہوئے۔ ان سمیت یہ چھ بہن بھائی تھے۔ کم عمری ہی میں شفقت پدری سے محروم ہو گئے۔ موسیقی موروثی طور پر تمام بہن بھائیوں کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑ رہی تھی۔

سب سے بڑے بھائی بمل داس گپتا، پھر کمل داس گپتا اور پھر سبل داس گپتا تین بہنیں سدھیرا، اندرا اور بسنتی تھیں۔ چھ کے چھ بہن بھائی مادر زاد سریلے تھے۔ تمام بہن بھائیوں نے HMV گراموفون کمپنی میں مغنی، مغنیہ اور میوزک ڈائریکٹر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔

کمل داس گپتا نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم نابغۂ روزگار موسیقار خاں صاحب اُستاد ضمیر الدین خاں سے حاصل کی۔ چھوٹے بھائی سبل داس گپتا نے بھی خان صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ خیال اور ٹھمری کی گائیکی میں خان صاحب نادر روزگار تھے۔ یہیں کمل داس گپتا کی ملاقات شہرۂ آفاق بنگالی شاعر، موسیقار قاضی نذر السلام سے ہوئی قاضی صاحب نے بھی خان صاحب استاد ضمیر الدین خاں سے اکتساب فیض کیا تھا۔

اپنے عہد کے مقبول مغنی جگ موہن کیا ابھی مذکورہ خاں صاحب ہی کے شاگرد دار جمند تھے۔ کمل داس گپتا نے بیس سال کی عمر میں بی کام کیا اور فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ HMV میں ملازمت کر لی۔ اپنے فنی کیریئر کے ابتدائی چند سالوں میں انہوں نے بنگالی نغمات کی طرز سازی میں ایک سنہرے باب کا اضافہ کیا۔ غزل، گیت، بھجن ان اصناف میں انہوں نے اپنے جوہر خوب خوب دکھائے خوبصورت اور دل موہ لینے والی طرزیں بنائیں۔ بعد کو انہوں نے نعتوں کی جو خوبصورت اور مؤثر طرزیں بنائیں بلکہ خود بھی نعت کو اپنی

Scanned with CamScanner

آواز دی۔ نعتوں میں اُن کا ساز و آواز یہ ایک الگ موضوع، سر دست اس موضوع کے مزامیر کے تاروں کو نہیں چھوتا کہ اس کی ایک الگ کہانی ہے پھر کبھی سہی۔

اپنے ابتدائی دور کے پانچ سات سالوں میں انہوں نے کمال خوبی اور کمال فن سے جدتیں پیدا کیں۔ اختراعات کیں۔ آرکسٹرا کو حسن اختصار دیا اور کئی خوابیدہ فنی باریکیوں کو بیدار کر کے اُجاگر کیا۔

ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ طرزوں کی کثیر تعداد کے باوجود بھی اکثر طرزوں کو کمال خوبی سے یکسانیت اور یکسانیت کے سبب سماعت میں اکتاہٹ پیدا کرنے سے بچائے رکھے۔ 1943ء انہیں بنارس یونیورسٹی نے میوزک پر ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ مغربی سازوں اور مشرقی مزامیر کے امتزاج سے ایک خوشگوار تاثر دیا۔

اپنی بے پناہ انتھک محنت، لگن اور خداداد ذہانت و فطانت اور اپنی تخلیقی اپج کے باعث وہ ترقی کرتے کرتے ہر ماسٹرز وائس ریکارڈنگ کمپنی (بشمولہ کولمبیا) کی چیف میوزک ڈائریکٹر کے عہدے پر پہنچے اور تقریباً ربع صدی تک اس عہدے پر مامور رہے۔

فلم کے میوزک ڈائریکٹر کے طور پر اُن کا کیریئر 1936ء میں بنگالی نغمات سازی سے شروع ہوا۔ 1967ء تک یعنی تقریباً تیس سالوں میں انہوں نے تیس بنگالی فلموں کا بڑا ہی دل موہ لینے والا میوزک دیا۔

1942ء میں اُن کی اوّلین اُردو فلم نغمہ بار شاہکار کے طور پر منظر عام پر آئی۔ فلم میں کل دس نغمات تھے۔ انہوں نے اس فلم کی نامورترین ہیروئین..... گلوکارہ کانن بالا کے علاوہ گلوکار است برن اور گلوکارہ انیما داس گپتا کی آوازیں لیں۔ شائقین موسیقی یک لخت فلم ''جواب'' کے نغمات کی طرف متوجہ ہوئے۔ مذکورہ فلم کے تقریباً تمام گیت معروف رہے مگر کانن بالا کی آواز میں اس فلم کے دو نغمات آج بھی سدا بہار پھولوں کی طرح مہک رہے ہیں۔

یعنی اے چاند چھپ نہ جانا

اور طوفان میل ..... یہ دنیا طوفان میل

1942ء تا 1951ء انہوں نے سولہ اُردو فلموں کی موسیقی دی۔ ان کی اُردو فلموگرافی اور ان فلموں سے منتخب نغمات کا جدول آپ کے ملاحظے کے لیے مضمون کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔

جیسے کہ میں پہلے کہیں آغاز میں لکھ چکا ہوں کہ کمل داس گپتا وہ واحد میوزک ڈائریکٹر ہیں جس کے غیر فلمی گرامون ریکارڈز نے ان کی فلمی نغمات کے مقابلے میں بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ فلم جواب کے چند نغمات اور دو ایک فلموں کے کچھ نغمات ضرور مقبول ہوئے مگر ان کی اصل شناخت وجہ شہرت اُن کے وہ غیر فلمی نغمات (غزلیں، گیت) ہیں جو انہوں نے HMV میں 1941ء تا 1947ء تخلیق کیے۔ سچ کہا گیا ہے کہ

"..... شاعر شعر کو تخلیق کرتا ہے جبکہ موسیقی موسیقار کو" (امیر خسرو) قاضی نذر السلام کے کلام کو جس مخصوص اسلوب کا رنگ ملا آہستہ آہستہ وہ باقاعدہ بنگالی موسیقی کا ایک الگ School of Gaaeki بن گیا۔

رابندر اسنگیت، شیاما سنگیت اور نذر الا گیت اپنی اپنی جگہ ان کی انفرادی خصوصیات کی دھومیں رہیں۔ قاضی نذر الاسلام کے سینکڑوں گیت کمل داس گپتا نے کمپوز کیے۔ گپتا کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ قاضی نذر الاسلام نے کہا تھا: "کمل داس گپتا میرا کلام بغیر میری اجازت کے جب چاہے لے سکتے ہیں اور اسے کمپوز کر سکتے ہیں"۔

بنگالی موسیقی اور بنگالی طرز ادا اور گائیکی سے دلچسپی رکھنے والے اور اس کا ادراک رکھنے والے واقعی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ کمل داس گپتا نے قاضی نذر الاسلام کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ ہمنت کمار مکرجی، جگ مون مترا، طلعت محمود، جو میرے کارواں فیروز بیگم، کانن بالا، کملا جھریا، یہ وہ معتبر ترین نام نامی ہیں جن میں سے اکثر کا فنی (کانن بالا اور کملا جھریا دونوں کو چھوڑ کر) اُن دنوں (یہ سال) میں شروع ہوا جن دنوں کمل داس گپتا کو میوزک ڈائریکٹر کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے پانچ سات سال گزر چکے تھے۔

1940ء تا 1947ء یہ وہ پانچ سات برس ہیں جن میں ہمارے زیر موضوع میوزک ڈائریکٹر نے مذکورہ مغنیوں اور مغنیاؤں کے لیے متنوع راگ راگنیوں پر مامور ماخوذ طرزیں بنائیں اور یہاں ایک اور قابل اعتنا پہلو یہ بھی ہے اس عرصے میں لکھے گئے نغمات کی کثیر تعداد کے خالق فیاض ہاشمی ہیں جو کہ اُن دنوں HMV میں ملازمت (بطور شاعر) کرتے تھے اور گپتا جی کے بڑے قریبی دوست تھے۔

تذکرہ عرض کرتا چلوں کہ فیاض ہاشمی کی بطور شاعر آغاز ہی میں خوش بختی رہی کہ اُن کے لکھے ہوئے بہت سے گیت (غیر فلمی) (اور چند غزلیں) مسوق الذکر فنکاروں نے گائے وہ اکثر ہٹ ہوئے اور کچھ تو Proverbial حیثیت اختیار کر گئے مثلاً۔

تصویر تیری دل مرا بہلا نہ سکے گی

چودھویں منزل پہ ظالم آ گیا

اور پھر یہ کہ تم میرے سامنے آیا نہ کرو

اسی طرح سب دن ایک سمان نہیں

یہ مقبولیت اپنی جگہ مسلم مگر خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔

فیاض ہاشمی کے باطن میں نہفتہ باکمال شاعر برسوں بعد منظر عام پر آیا۔ فیاض ہاشمی کے اُن برسوں میں لکھے گئے نغمات پر ایک ناقدانہ تبصرہ چند الگ صفحات کا متقاضی ہے یہاں اس کا موقع محل نہیں اگر اللہ کو منظور ہو تو اس حوالے سے بھی ایک مضمون سپرد قلم کروں گا۔

فنون لطیفہ کے حوالے سے دیانت داری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے اُن نغمات کی کمپوزیشنز فیاض ہاشمی کو بھی سونا بنا گئیں۔ فیاض ہاشمی کے اعلیٰ اور صف اول کے شاعر ہونے میں (میری دانست میں) دو رائیں نہیں ہو سکتیں مگر اس وقت صرف اُن نغمات کا ذکر ہے جو

Scanned with CamScanner

ہوں جو تب ہٹ ہوئے تھے وگرنہ بعد کو فیاض ہاشمی نے اُن غیر فلمی نغمات کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوبصورت ادبی لاجواب اور چونکا دینے والے نغمات تخلیق کیے۔ یہاں میں ایک بزرگ موسیقی دان، محقق موسیقی اور کمل داس گپتا کے ایک بلند پایہ صاحب علم وادب مداح جناب ایس۔ ایم شاہد کی عمدہ تصنیف کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ جوانہوں نے انگریزی زبان میں اپنے ممدوح پر لکھی۔

Kamal Das Gupta

(Alis Kamal Ahmed unforgetable Geets)

مطبوعہ کراچی

محترم پیارے دوست شاہد پردیسی اور مکرم فیاض احمد اشعر کا ممنون ہوں۔ اوّل الذکر نے نغمات کی تفصیل سے نواز ااور مؤخرالذکر کرنے اپنے آواز خزانہ سے کچھ نایاب نغمات سے مری سماعت کو نواز، اور میں نے مضمون کو مستطاب بنانے کے لیے جناب ایس ایم شاہد کی محولہ بالا تصنیف سے بھی استفادہ کیا۔

یہ تصنیف بہت ہی جامع ہے اور حسن اختصار و جمال ترتیب کا عمدہ جمالیاتی نمونہ ہے۔ کمل داس گپتا کے ساتھ ساتھ ان فنکاروں کے بارے میں خوبصورت تعارفی مواد مل جاتا ہے۔

جگ موہن مترا، ہیمنیت کمار مکرجی، طلعت محمود، فیروز بیگم جوتیکا رائے اور کانن بالا۔

مذکورہ فنکاروں کی آوازوں نے فیاض ہاشمی کے نغمات کو جب کمل داس گپتا کے سُر ساگر میں (فیاض ہاشمی کے علاوہ چند دیگر شعرا کا کلام بھی گایا گیا) اشنان کروایا تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی اور فیاض ہاشمی سمیت تمام مذکورہ فنکاروں کو امر کر گئی۔ البتہ کانن بالا (کانن دیوی) کا معاملہ خاصا مختلف ہے کہ وہ اس دور سے کئی سال قبل اپنے فن اور حسن صدا کا لوہا منوا چکی تھیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب کے نغمات اور ہسپتال کے دو ایک نغموں نے کانن دیوی (کانن بالا) کو ایک نئی تازگی دی۔

آل انڈیا ریڈیو ویلی کی Signature Tune بھی کمل داس گپتا ہی کی تخلیق ہے اور اُس میں جو گداز پایا جاتا ہے اس سے کسی بھی موسیقی دان کسی بھی کن رسیے کو انکار نہ ہوگا۔

صاحب تصنیف نے اپنی اس لائق مطالعہ تصنیف میں اُن سازوں کا ذکر (مع تصاویر) بھی کیا ہے جو گپتا عموماً اپنے آرکسٹرا میں استعمال کیا کرتے تھے۔

ٹرمپٹ، الغوزہ، وائلن، طبلہ، ستار، دف (ڈفلی) (مزامیر نوازوں کے نام) مع تصویر موجود ہیں۔

کمل داس گپتا کی طرزوں میں پایا جانے والا مخصوص سوز و گداز جو اول سے آخر تک اُن کی شناخت رہا اُس کا ذکر بھی ایک فنی نکتے کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اور ٹرمپٹ الغوزہ اور وائلن کے استعمال کی نشانی دہی بھی اس گداز کے پس منظر میں کی گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

گداز، سوز، دکھ اداسی Pathos and Sadness ان عناصر کا تعلق مزامیر سے قطع نظر سوز دروں سے بھی ہوتا

اور یہی سوز اللہ نے مکمل داس گپتا جی کو بڑی فیاضی سے عنایت کیا تھا۔

گانے کے لیے سوز چاہیے ساز نہیں (امیر خسرو)

واہ امیر خسرو جی! آپ کے بل بل جاؤں کیا چونکا دینے والی بات کہہ گئے آپ۔ سچ ہے بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

جوتیکا رائے کا شہرۂ آفاق گیت "چپکے چپکے بول مینا" جب ریکارڈ ریلز ڈ ہوا تو اس نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ اور جب مکمل داس گپ

کی دلنشین اور مؤثر موسیقی میں جوتیکا رائے نے بہت سارے بھجن گائے تو ایک عجیب سماں بندھ گیا۔

جوتیکا رائے بھجن کی اور بھجن ان کا ہو کر رہ گیا۔ اس مقبولیت کے دور میں ذرا اس سے چند ایک سال بعد مکمل داس گپتا نے نعتوں

کے لیے بھی طرزیں بنائیں اور خود کچھ نعتیں جوتیکا رائے کی سنگت میں گائیں بھی مگر تعصب کے باعث ردعمل یہ ہوا کہ ایک سلگن بنگالی

جلن اور یہ جلن رفتہ رفتہ شعلگی میں متبدل ہوگئی۔ شومئی قسمت کہ ان کے بہت سے قدردان ان سے عناد پر اتر آئے۔ یہ خاموشی اپنے اندر

ایک مضمر سا ہنگامہ لئے پھرتی رہی اور دوستوں کے رویوں سے اس بے قصور میوزک ڈائریکٹر کی دل کی دیواریں شکستگی کی وجہ سے دھیرے

دھیرے ڈھہتی رہیں۔

اسی دل برداشتگی کے عالم میں انہوں نے کلکتہ سے ہجرت کر لی اور ڈھاکہ آن بسے۔

سوز بنگال، فیروز بیگم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے حوالے سے ہی وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور انہوں نے

اپنا نام، کمال احمد رکھ لیا۔ یہ 1956ء کی بات ہے۔ پانچ سات سال خوشگوار گزرے مگر آنے والے سالوں میں قسمت نے اُن کے ساتھ

روٹھ جانے کا شاید تہہ کر لیا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ اپنے عہد کا پارس، کمل داس گپتا (المعروف، کمال احمد) جنس کا سد بنتا چلا گیا۔

گردش دوراں نے انہیں آئے دن نت نئی الجھنوں سے دوچار رکھا۔ معاشی مسائل اُن پر محیط زیست تنگ سے تنگ کرتے گئے

اور چالیس کی دہائی میں اپنے غیر فلمی گرامون ریکارڈز کی طرزوں کے باعث بے پناہ مقبولیت حاصل کرنے والا یہ باکمال میوزک

ڈائریکٹر 12 جولائی 1974ء (بروز جمعہ باسٹھ برس کی عمر میں) کو کسمپرسی کی حالت میں یہ فانی دنیا ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔

کچھ تو دنیا کی عنایات نے دل توڑ دیا

اور کچھ تلخی حالات نے دل توڑ دیا

بڑا ہو مکر وہات دوراں کا تلخی حالات کا ذہب ساز کیمیا گر کو جنس کا سد بنا دیتے ہیں۔ مگر جوتیکا رائے کے شاہکار بھجنوں کو بھلا

کون بھلا پائے گا۔

کانن بالا کی اداس کر دینے والی پر گداز آواز اپنے سحر بنگال کے جلوے میں خیمۂ سماعت میں اپنے ..... پڑاؤ ڈالتی ہی

Scanned with CamScanner

رہے گی۔

جگ موہن مترا، ہمنیت کمار اور طلعت محمود کے گائے ہوئے نغمات کی طرزیں امر ہیں.....امر.....کمل داس گپتا کی طرح.....اور.....اور پھر کمال احمد (کمال داس گپتا) کی رفیقۂ حیات گداز بنگال۔ فیروز بیگم کی یہ کوک بھلا کس صاحب حال کو مضطرب نہیں کرے گی کہ یہی خوابیدہ خوابیدہ سا کرب واضطراب اس منفرد میوزک ڈائریکٹر کی بنیادی شناخت ہے کہ

تم بھلائے نہ گئے ہائے بھلائے نہ گئے
ہم سے یہ دیپ بجھائے نہ گئے

FILMOGRAPHY

فلم	ادارہ	ہدایت کار	
1۔ جواب	ایم پی پروڈکشن	پی۔سی بروا	1942ء
2۔ ہسپتال	ایم پی پروڈکشن	سونیل محمار	1943ء
3۔ رانی	بروا پروڈکشن	پی۔سی بروا	1943ء
4۔ میگھ دوت	کیرتی پروڈکشن	دیو۔کی بوس	1944ء
5۔ عربین نائٹس	پی آر پروڈکشن	نرن لہری	1946ء
6۔ بندیا	سن آرٹ پروڈکشن	سی۔ایم لوہار	1946ء
7۔ پہچان	نیو ناکیز	پی۔سی بروا	1946ء
8۔ کرشن لیلا	گیان جلی پکچرز	دیو کی بوس	1946ء
9۔ زمین آسمان	سبھاگیہ پکچرز	دوار کا گھوسلہ	1946ء
10۔ گری بالا	مدھو بوس پروڈکشن	مدھو بوس	1947ء
11۔ فیصلہ	گیان جلی پروڈکشن	اپروا مترا	1947ء
12۔ چندر شیکھر	بائز پکچرز	دیو کی بوس	1948ء
13۔ جے یاترا	ویٹگارڈ پروڈکشن	نرمی لہری	1948ء
14۔ ایران کی ایک رات	سولر فلمز	بروا	1949ء

Scanned with CamScanner

منتخب فلمی نغمات

بول	فلم مع سن	شاعر	
1۔ اے چاند چھپ نہ جانا	جواب 1942ء	پنڈت مدھر	کانن بالا
2۔ طوفان میل یہ دنیا طوفان میل	جواب 1942ء	پنڈت مدھر	کانن بالا
3۔ کچھ یاد رہے تو سن کر جا	جواب 1942ء	بیکل	کانن بالا
4۔ میری مجبوریوں نے مراد امن	ہسپتال 1943ء	پنڈت بھوشن	کانن بالا
5۔ دل بھی کیسا ہے نادان	رانی 1943ء	مدھر	کوشلیا
6۔ اور ورشا کے پہلے بادل	میگھ دوت 1945ء	فیاض ہاشمی	جگ موہن
7۔ آج ہوئی ہے بھور سہانی پہلی بار	مرین نائٹ 1946ء	فیاض ہاشمی	کانن بالا
8۔ میرا بچپن روٹھا جائے	بندیا 1946ء	مدھر	لتا منگیشکر
9۔ چندا اور گگن میں بلائے	کرشن لیلا 1946ء	فیاض ہاشمی	کانن بالا
10۔ پربت کے پاس میرا چھوٹا سا گاؤں	زمین آسمان 1946ء	فیاض ہاشمی	کلیانی
11۔ بے ایمان تورے نیناں جادو کرے	من مانی 1946ء	مدھر	کلیانی داس
12۔ جیا ڈولے جیا ڈولے اور ہوے ہولے	چندر شیکھر 1948ء	پنڈت مدھر	کانن بالا

منتخب غیر فلمی غزلیں اور نغمات

بول	شاعر	آواز
1۔ دل کو ہے تم سے پیار کیوں	فیاض ہاشمی	جگ موہن
2۔ تم میرے سامنے آیا نہ کرو	فیاض ہاشمی	جگ موہن
3۔ نراس میں آس پر بھو میرا	فیاض ہاشمی	جگ موہن
4۔ آج شرابی آنکھوں سے پینے کی ہم نے ٹھانی	فیاض ہاشمی	ہمنیت کمار
5۔ آنچل سے کیوں باندھ لیا مجھ پردیسی کا پیار	فیاض ہاشمی	ہمنیت کمار

Scanned with CamScanner

6۔ [illegible] ڈھونڈھنے پھرتے ہیں	رضی بنارس	ہمیت کمار
7۔ [illegible] دل مرا بہلا نہ سکے گی	فیاض ہاشمی	طلعت محمود
8۔ [illegible] دن ایک سمان نہیں تھا	فیاض ہاشمی	طلعت محمود
9۔ [illegible] منزل پہ ظالم آ گیا	فیاض ہاشمی	طلعت محمود
10۔ معلوم نہیں کیوں	فیاض ہاشمی	فیروز بیگم
11۔ تم بھلائے نہ گئے ہائے بھلائے نہ گئے	فیاض ہاشمی	فیروز بیگم
12۔ [illegible] بول مینا	پنڈت بی سی مدھر	جوتھیکا رائے
13۔ کل کے [illegible] آج بھی آنا	پنڈت بی سی مدھر	جوتھیکا رائے
14۔ [illegible] یاد دل سے بھلائی نہ گئی	نعت	جوتھیکا + کمل داس گپتا
15۔ جس سے راضی ہو خدا خود	//	//
16۔ محبوب کے گھر جانا اللہ کے گھر	//	//
17۔ مجھے پنوں سے کون جگائے رے	//	کانن بالا
18۔ آنکھوں کی روشنی	//	کانن بالا

نمود خرید کر پڑھیں اور اپنے
احباب کو بھی اس کارِ خیر کی
ترغیب دیں۔

Scanned with CamScanner

تنویر قاضی

نمک

کسی کو بھی صحیح طور پر معلوم نہیں کہ یہ کون سا لمحہ تھا کہ جب سب کچھ تلپٹ ہو کر آپس میں یوں الجھا کہ وہ سارے کے سارے
ٹھہر گئے۔ تب ان کے درمیان ایک یدھ اور تصادم نے جنم لیا۔ ہر طرف لہو بہا اور جما۔ سارے نباتات اس واقعے کے جبری گو
بنے۔ اپنا منہ ایک دوسرے سے چھپاتے تھے، نظریں چراتے تھے۔ یہ ایک بے مثل خیانت تھی جو اپنی تمام کثافت بے جمال کے ساتھ ا
لے آس پاس آ برہنہ ہوئی تھی۔ اس ہونی کی حدّت میں جل کر راکھ ہوئے درختوں کے تنوں پر لکھی گئی تاریخ بھی بھسم ہو رہی تھی۔

تب ان کملوں اور سیانوں میں موجود ان چنیدہ سیانوں نے آپس میں مشورے کے بعد ادھر جانے کا ارادہ کیا۔ وہ پہاڑوں
طرف چلے، ان کی رفتار سست ضرور تھی مگر یہ متوازن اور مسلسل تھی۔ سو وہ چلتے اور چلتے رہے۔ ان کی بدھی میں یہ بات جم جما گئی تھی کہ ان
نجات اس دانش مند، سیانوں کے سیانے کے پاس تھی جو کہ اوپر سب سے اونچے پہاڑ کی ایک کھوہ میں رہتا تھا۔ اس کے اردگرد برف
تھی، وہ کیا کھاتا تھا اور کیا پیتا تھا کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ آج تک کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ اس کے متعلق کچھ کہنے اور بتانے والے وہ چ
ایک ضدی، ہٹیلے اور جفاکش چرواہے تھے جو اپنے ریوڑوں کو ادھر ایسی بلندیوں پر لے آنے کے فخر سے مالا مال رہنے اور منفرد کہلانے کے
خبط میں مبتلا تھے۔ ان گھمنڈیوں کی کمر کے پٹکوں میں اڑسے تیز دھار والے خنجر ان کی حفاظت کرتے تھے لیکن تیز برفیلی ہوا کی چھریوں
سے انہیں یہاں بچانے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ فطرت کی کرختگی کی کھردری باہوں میں لہراتے رہتے تھے۔ وہ فطرت کی اس ننگی
جارحیت کے سب سے بہتر جانو تھے۔ اس لئے سارے ان پُرعظمت وجودوں کی اس ماورائی قوت کے حوالے سے انہیں یاد کرتے
تھے۔ وہ ان کو اپنے سے یقیناً برتر سمجھ کر ان سے کسی قدر خائف بھی رہتے تھے۔ ان چرواہوں کے بھاری بھرکم لبادے، سموری ٹوپیاں
اونی موزے اور مضبوط جوتے بھی ان کے لئے کسی عجوبے سے کم نہ تھے۔ برفانی ہوا کے جلو میں سفر کرنا ان کے منہ سے نکلا ہر ہر لفظ یہاں
کے سطح مرتفائی لوگوں کے لئے ایک طرح کا آئین موجود تھا۔ اس لئے انہیں اس کھوہ والے کے وجود پر اپنی ذات کی طرح ہی یقین تھا۔
وہ کہتے:

اُدھر وہ ہے وہ اپنی بند آنکھوں کو کبھی کبھی کھولتا ہے، وہ پلکیں جھپکاتا ہے اور پھر اپنی آنکھیں میچ لیتا ہے۔ وہ ایک منفرد یوگا آسن کو
اختیار کئے ہوئے پھر سے بدبدانے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں کا نیلا بلور ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہوا لگتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ یہ بلور

Scanned with CamScanner

بہت کم کسی کو دیکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کی بڑبڑاہٹ میں موسیقی ہے۔ وہ سارے کا سارا وہم ہے، رحم، قہر، طاقت، محبت اور دلجوئی کا پیکر اپنی شکل میں بے مثل وہ عقدہ ہے جسے ابھی حل ہونا ہے کہ وہ عین فطرت ہے اور فطرت ابھی صحیح طور پر پڑھی نہیں گئی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اس کی آنکھوں میں مکمل طور پر جھانک نہیں سکا ہے۔ سو وہ چلتے ہیں، چلتے رہتے ہیں۔ ان کے پاؤں تھکتے ہیں، پھر زخمی ہوتے ہیں ان کے جسم کمزور ہونے لگتے ہیں۔ کپڑے ان کے جسموں سے لپٹے پھٹ پھٹا جاتے ہیں۔ وہ راستے کی جھاڑیوں کی شاخوں سے نچوڑا ہوا جوس پیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کو چبانے کے لئے بس کنکر ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ نچڑے ہوئے، نڈھال اور بے حال و بے دم ہوئے ایک دوسرے کے اوپر گرتے پڑتے آگے رواں رہنے کا کشٹ کرتے ہیں۔ یوں کپڑے دھجیاں بن کر ان کے جسموں سے علیحدہ ہو کر انہیں عریاں کر دیتے ہیں۔

وہ عریاں اور برہنہ پا

اس بے اشجار دیار میں اس تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہیں

اور اُدھر پیچھے

وہ ہیں جنہیں وہ ان کے چلن کی خرابی کے باعث وہاں چھوڑ کر اِدھر کو آتے ہیں

مڑ مڑ کر پیچھے بھی دیکھتے جاتے ہیں

ایک کڈھب سا راہب نما، جھلا، کھادی پہننے والا، اس صحرا سے مماثلت رکھنے والے پگڈنڈی نما راستے کے کنارے ایک کٹیا میں موجود ہے۔ وہ اپنے مٹی کے پیالے سے اپنے سر، منہ اور داڑھی پر پانی گراتا ہے اور کہتا ہے:

ادھر ایک مسلسل الاؤ بھڑکتا ہے وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوئے اپنی تلواریں، کرپانیں، ہتھوڑے، ڈانگیں، کرپے، کدالیں، روڑے، پتھر، skimmer (کفگیر، پونی کا ڈوئی، کڑچھی) قینچی استرے، منہ سے اگلتی گالیاں، طعنے، گلے شکوے، طنز، گھونسے، ہلسی، تفنن، استہزا اور اپنے بین تک کو ہتھیاروں کی طرح اپنے جسموں پر سجائے ایک دوسرے پر پل پڑے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے بہن بھائی، بیٹے بیٹیاں، چاچے مامے، بھتیجے بھانجے، خالائیں، پھپھیاں، ماں باپ، داڈے دادیاں اور نانے نانیاں ہیں۔ زبان ایک، جبلت ایک، خصلت ایک، آدم حوا، قابیل ہابیل اپنے ہی غصے کے پسینے میں نہائے ہوئے۔

ترسائے، اندر سے روگی، ڈھونگی

راوی کہتا ہے

یہ اس مٹی دیس میں یہاں وہاں ضرور بکھرے پڑے تھے پر تھے بڑے بپھے۔ ایک کنبے کی طرح تھے یہ سارے۔ وہ دن کو اپنی مائیں مل چلاتے تھے، اور رات کو ان کی عورتیں ان کی زمینیں بن جاتی تھیں۔ وہ اپنی نسل بڑھانے میں بڑے تیز تھے، وہ اپنی بھوئیں

ہر جا بجا خودرو بوٹی کو گھوٹتے اور سادی کو اپنے اندر اتارتے ہوئے خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے تھے۔ وہ خوش حال تھے ان کے بھڑولے اناج سے بھرے رہتے تھے۔ ان کی آبادیوں کے گرد بھرے پانیوں والے دریا بہتے تھے۔ ان کے ڈھور ڈنگر اور وہ خود بھی اپنی زندگی بخش پانیوں میں ڈبکیاں لگاتے تھے۔ انہوں نے سیلابوں اور دوسری قدرتی آفات کے خلاف لڑنا سیکھ لیا تھا۔ انہوں نے سب پر ہر چیز پر فتح پالی لیکن اپنے آپ کو زیر نہ کر سکے۔ خواہشات کا ایک پلندا اور انبار ان کی آنکھوں کے سامنے ناچتا رہا تھا۔ یوں وہ میرتیرے گئے۔ لوٹ کھسوٹ ہونے لگی، وہ جو محترم تھے، کاریگر تھے، مخلص تھے، چوہڑے قرار دے دیے گئے۔ یوں ان کے درمیان میں سے اشراف ابھر آئے۔ وہ مالک اور دوسرے کی کمین، حقیر، سماج باہر، ذلت، محبت ان کے درمیان چرمری ہو کر رہ گئی۔ پھر ایک دن طاقتوروں نے محبت کو ذبح کر دیا۔

راوی چپ ہو جاتا ہے۔ وہ پانی سے خالی پیالہ اپنے سر پر مارتا ہے۔ پیالہ دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر بہتا تاریخ کا دریا پچھاڑتا ہے اور وہ اس میں ڈوب کر اپنے دکھ اور غم کا مداوا کرتا ہے۔ ادھر وہ جو آگے بڑھ رہے ہیں اب تعداد میں بہت کم رہ گئے ہیں۔

ان کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ اب یہ چند برہنہ پا، برہنہ بدن، بھوکے پیاسے بندوں کی ٹولی ہے۔

وہ اپنے شل پاؤں کے ساتھ آگے گھسٹتے رہے۔ جب گچھا نزدیک آ گئی اور وہ گچھا کے منہ کے آگے چھائے اندھیرے کے کنارے تک پہنچ گئے تو ان کی نیت میں فتور آیا۔ ہر کوئی اس تک پہلے پہنچنے کی کوشش میں دوسرے کو دھکیلتا تھا۔ وہ نقاہت کے باوجود آپس میں لڑ پڑے۔ ان کے اس گھمسان کے رن میں سب مر مرا گئے۔ بس ان میں سے ایک ہی رہ گیا۔ وہ تفاخر سے اپنی گردن اکڑائے گچھا کے دروازے کی دہلیز تک آ پہنچا۔ آگے سے ایسی گرم ہوا کے لبو چلے کہ وہ اس کے ساتھ پھسلتا نیچے گرا اور پھر لڑھک گیا۔ وہ اٹھا، پھر ادھر آیا، ادھر سے پھر اسی گرم ہوا جیسا جواب آیا۔

وہ دور کھڑا رہا اور جلتی ہوا

آقا، مہربانی کرو

اُدھر ہمارے دیس پدھارو

اندر خامشی کی گھمکار تھی

یہ ادھر ہی بیٹھا رہا سوکھتا رہا اور بالآخر مر گیا

پچھلے جو تھے اس سارے واقعے سے بے خبر اپنے اسی فساد میں مبتلا رہے

پھر ایسا ہوا کہ وہ سیانوں کا سیانا اپنی تنہائی اور اکلاپے سے اکتا کر ایک دن خود ہی نیچے اترنے کو ہوا وہ اٹھا اس نے خود کو جھٹکا۔ اپنے آپ کو جھاڑا۔ مٹی کا ایک گھنا غبار اڑ کر اس کے گرد ناچنے لگا۔ وہ اس مٹی کے غبار سے خوب جی بھر کر نہایا اور پھر باہر آیا۔ وہ چلا،

Scanned with CamScanner

لا ھکا، پھسلا۔ اس نے محویت کے ہالے کو ترک کیا تو راستے کی پھسلن اور لڑھکنیاں اور پٹخنیاں اس کا مقدر بنیں۔ اس نے کئی پہاڑ، دریا، ی تا لے سمندر، اور صحرا عبور کیے۔ اس نے اپنے سامنے چاند کو چاند ہوتے دیکھا جو زمین کے گرد 0.63 میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ایک مہینے میں اپنا چکر پورا کرتا ہے۔ وہ مسکرایا، یہ سارے چکرائے ہوئے ہیں ابھی تک۔ یہ کھوتے رہے کھرنا معلوم کو معلوم کرنے کے چکر میں ممن چکر بن جاتے ہیں۔ وہ اس بھید کو پانے کے چکر میں کھجل خراب ہو رہے ہیں کہ یہ سن کیا دھرا کس کا ہے۔ کبھی کسی پر الزام دھرتے ہیں ابھی وہی ان کی زد میں آ جاتا ہے جس کے کھوج میں ان کے اعضا تھک کر ٹوٹنے لگتے ہیں، حالانکہ انہیں جان لینا چاہیے چونکہ باورچی نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس لئے بیرے نے کیا ہے وہ پھر مسکرایا لیکن اب کے اس کی مسکراہٹ میں حیرت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایک بار اس یونانی نے کہا تھا کہ حیرت فلسفے کی ابتدا ہے۔ نادان شاید نہیں جانتا تھا کہ خود کائنات کی ابتدا میں ایک عظیم حیرت سے بھری پڑی ہے۔ وہ پھر بڑبڑایا اور اپنے آپ میں کود گیا۔ وہ باہر آیا تو بلیک ہول کے کنارے سے سرک رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کون سا وقت ہے، دن ہے کہ رات، کتنے بجے ہوں گے ان دنیاوی گھڑیالوں میں۔ اس سفید بالوں والے شدائی جس کا دماغ سب سے زیادہ وزنی تھا نے کہا تھا کہ وقت اس نے دریافت کیا ہے۔ یہ وقت اصل میں ہے کیا؟ روشنی کی ایک چلتی لہریا بحر۔ اس نے ایک بار ٹھٹھول کیا اور بے نیازوں کے بے نیاز سے متعلق کہا "وہ ایک بڈھا ہے۔" اب E=Mc کے نظریے کا خالق کوئی گھامڑ شخص تو نہیں تھا۔ اس سے ایک طالبہ نے سوال کیا اگر آپ نے اس نظریے کی تصدیق نہ ہو پاتی تو آپ کا ردعمل کیا ہوتا۔ جواب ملا، تو مجھے اپنے پیارے خدا پر افسوس ہوتا۔ اب کے وہ ہنس دیا ان بوتوں کو کیا اس بات کا علم ہے کہ یہ سارے ایک ایسے وقت میں زندہ ہیں جب کائنات کی عمر کا 1/8 حصہ گزر چکا ہے جب کہ یہ تیزی سے پھیل رہی ہے۔

اس نے اس سفر الفت و کلفت میں ہر جا دیکھا۔ اسے ایک تنہا پھول نظر آیا اور اس کے سینے سے چمٹا بلبل بھی اس کی نگاہوں میں آیا۔ پھر گندے اور بدبودار پانی میں سے اپنا سر نکالتا کنول بھی اسے نظر آیا۔ اس نے اس کا بوسہ لیا۔ وہ لہلہا اٹھا۔ اسے بے شمار جنور نظر آئے۔ وہ اپنے پاؤں سے دھول اڑاتے تھے اور اپنے گلوں میں پڑی گھنٹیاں جھلاتے تھے۔ اسے کالے بدنوں والی مخلوق نظر آئی۔ یہ بھاپ چھوڑتے گرم پانی میں اپنے پاؤں ڈبوئے اپنی کمر کو سورج کے سامنے کیسے الاہیں لگا رہے تھے۔ کل کو یہاں ہر طرف دھان ہی دھان ہوگا۔ وہ جھجکا، یہ ایک ننگ دھڑنگ تھا، سوئے کے پانی میں چھلانگ لگانے والا بارہ سالہ بچہ۔ اپنے گھر کے صحن میں ہاتھ سے نل چلاتی ہوئی سورنی نہائے جا رہی تھی۔ اسے شرم آ گئی، اس نے نگاہ نیچی کی اور آگے بڑھا وہاں ایک بے شرم ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا ٹٹی کر رہا تھا لیکن بے شرم کیوں بھئی، اس نے خود سے پوچھا۔ جو اس نے منہ کے راستے کھایا ہے اب نیچے سے خارج تو کرے گا۔ ایسے میں اس نے جھپ لیسی، اس کا دھیان ایک اور طرف ہوا۔ یہ ان پرندوں کی قطار تھی جو سائبریا کی یخ بستگی سے دور دراڑے کے دریائے نیل کے ڈیلٹا کی طرف گرم فضا کی طرف جاتی تھی۔ ان میں باز، کونجیں، شارکیں، مینائیں، بلبلیں اور رنگ برنگی چڑیاں تھیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ باز ان پر کمزور اور چھوٹے پرندوں کو جو عام حالات میں ان کی غذا ہو سکتے تھے، لاد کر لئے جاتے تھے یعنی وقت، ماحول اور ضرورتوں کے

بہاؤ کے ساتھ انواع کے آپسی تعلقات کی نوعیت بھی بدلتی ہے۔ یہ باز اپنی منزل مقصود پر پہنچ کر چاہے ان پرندوں کو شکار کرتا
تب تک خیریت ہی خیریت تھی۔ وہ اپنی نظر اچکانا ہی چاہتا تھا کہ اسے ایک درخت کے ہرے پن میں چھپا ہوا وہ پرندہ نظر آیا جو
میں پکڑے ایک کانٹے کو اپنے سینے میں چبھو رہا تھا۔ اس کے سینے سے خون رس رہا تھا۔ وہ قطرہ قطرہ ہو کر مرنے کے سفر پر گامزن تھا۔
اس پر ترس آیا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اگر بچ بھی گیا تو پھر ایسا ہی کرے گا کہ یہ سارا کچھ اس کی جبلت کی تکمیل
میں رقم ہے۔ اسے بہر حال خودکشی ہی کرنی ہے کہ یہی اس کا مقدر ہے۔ یہ اپنی ہی نوع کا ایک انوکھا مظہر تھا۔ ایسے ہی سوچتے ہوئے
جانب دشت آیا۔ پھر اس کا گزر ایک وسیع بیاباں اور صحرا سے ہوا۔ وہاں ایک کالا ہرن ایک جھاڑی میں اپنے سینگ پھنسا بیٹھا تھا۔ اس
کے قریب ایک Rcttle Snake پھنکارتا چلا جاتا تھا۔ جہاں صحرا ختم ہوتا تھا وہاں کی آبادی کے آغاز میں بنی کوٹھی کے لان میں وہ
کا ملازم Lawn Mover چلا رہا تھا۔ ساتھ والے زیر تعمیر مکان کے لئے ایک مزدور Wall Brrow میں اینٹیں ڈھو رہا تھا۔ اس
کے ماتھے کے پسینے کے قطروں کے نیچے ایک Stark Blind فقیر صدا لگائے جا رہا تھا۔ قریب ہی موجود ایک Starling کی چہک
چیخ بننے کے لئے پر تول رہی تھی۔ جب ہی اس نے دیکھا کہ وہ ایک بستی کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ وہ ابابیلوں کے جھنڈ کے بیچ میں سے ہو
ہوا وہاں آ گیا۔ فی الحال یہاں شانتی تھی۔ فساد برپا کرنے والے شاید یہاں وہاں چھپ چھپا گئے تھے۔ اسے ان کا قہر مہر میں تبدیل ہو
نظر آیا۔ اس نے دیکھا بستی کے مردوں کے چہروں پر محنت کا غرور تھا۔ عورتوں کے لبوں پر البیلی مسکان تھی۔ بچے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے
تھے۔ بڑے بوڑھے اپنی نزاکت کے مشاغل سے دل بہلا رہے تھے۔ وہ چوک کی طرف آیا اور اس نے دیکھا کہ وہاں پر ایک طرف پچھلی
رات کی بارش کا پانی ایک چھپڑی کی صورت میں جمع تھا۔ ٹھہرے ہوئے پانی کے قریب اس نے دو بچیوں کو کھیلتے ہوئے پایا۔ ایک بچی نے
گندے پانی میں اپنا پاؤں رکھا اور پھر وہ اپنے پاؤں سے چھینٹے اڑانے لگی۔ ان چھینٹوں نے دوسری بچی کا خوبصورت فراک گندہ کر
دیا۔ وہ روتی ہوئی اپنے گھر کو چل پڑی۔ اس نے اس لڑکی کی حرکت کی شکایت اپنی ماں سے کی۔ اس کا باپ یہ بات سن کر باہر لپکا۔ وہ اس
بچی کے ماں باپ سے جا الجھا، گالی گلوچ، لاتیں گھونسے ان بچیوں کے لواحقین کے علاوہ اب دوسرے لوگ بھی اس لڑائی میں آ شامل
ہوئے تھے۔ جب لڑائی کا بازار خاصا گرم ہو گیا تو ایک شخص نے سب کی توجہ ایک جانب دلائی۔ وہ دیکھو جن کے لئے تم لڑ رہے ہو وہ تو
دونوں پھر آپس میں ویسے ہی کھیل رہی ہیں۔ ☆ لوگوں نے دیکھا تو اس منظر نے انہیں شرمندہ کر دیا۔ لیکن لوگ جب تک ایک دوسرے
سے مکمل طور پر علیحدہ ہوتے ان میں سے ایک شخص کا پھینکا گیا تیر اسے ماتھے پر آ لگا۔ اس کا ماتھا اس کے خون سے رنگین ہوا تھا۔ خون اس کی
ٹھوڑی اور داڑھی کو تر کرنے لگا۔ اس کے گال سے بہتا خون جب اس کے لبوں تک پہنچا تو پہلی بار اس نے اپنے خون کا سواد دیکھا، وہ
مسکرایا۔ اس کا مزہ تو زمین کے نمک جیسا ہے۔ اس نے دیکھا لوگ اب ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ ان کے اس فعل نے انہیں
شرمسار کر دیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے آپس میں گلے مل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے جلد خفا ہو جانے
والے.. دنگا فساد کرنے والے مگر آپس میں اتنی ہی محبت کرنے والے ان لوگوں کا ساتھ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے اکلاپے کی
لونی اتاری اور اندھے خلاؤں کی طرف اچھال دی۔

☆ "Children are wiser th Elders" تالستائی

Scanned with CamScanner

راشد جاوید احمد

موسم

شہر کے وسط میں بلند و بالا عمارتوں کے درمیان سڑکون پر لوگوں کا بہت بڑا ہجوم ہے۔ چالیس کے پیٹے کا ایک شخص بڑے جذباتی انداز میں زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر پرشور مجمعے سے خطاب کر رہا ہے۔ ہجوم اتنا بڑا ہے کہ ڈکٹافون کے استعمال کے باوجود بہت سے لوگوں تک مقرر کی آواز پہنچ نہیں پاتی۔ کچھ دیر بعد ایک بلند نعرے کی آواز آتی ہے لیکن الفاظ صاف سنائی نہیں دیتے۔

نعرے کی گونج کے ساتھ بلند و بالا عمارتوں میں گھری ایک ٹاور نما عمارت کی سب سے اوپر والی کھڑکی کھلتی ہے۔ ایک شخص کی شکل نظر آتی ہے۔ وہ ایمپلی فائر کی مدد سے کوئی اعلان کرتا ہے۔ لوگوں میں ہل چل سی پیدا ہوتی ہے۔ ان کا دائرہ پھیلنے لگتا ہے اور پھر وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ٹکڑیوں میں بٹا، ہجوم کی شکل اختیار کئے ہوئے یہ انبوہ بے ترتیبی سے رواں دواں ہے۔ نعروں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

ہیڈ کلرک بوٹا خان بغل میں دفتری فائلیں دبائے تیز قدم اٹھاتا دفتر کی طرف جا رہا ہے۔ سواری نہ ملنے اور ٹریفک جام کی وجہ سے اسے خاصی دیر ہو چکی ہے۔ اسکا آفیسر انچارج بہت ہی سخت مزاج ہے اور ذرا سی تاخیر بھی برداشت نہیں کرتا لیکن بوٹا خان کے راستے میں بہت بڑا ہجوم ہے۔ صبح کے دس بجے ہیں اور شہر کا درجہء حرارت 40 درجے سنٹی گریڈ سے تجاوز کر چکا ہے۔

"نہیں چلے گا۔۔۔ نہیں چلے گا۔۔۔۔" بہت سے نعروں میں سے ایک نعرہ ہے جو صاف سنائی دیتا ہے۔ بوٹا خان کے کانوں سے یہ نعرہ ٹکراتا ہے، وہ اسے اپنے ہونٹوں میں دوہراتا ہے انچارج کا کرخت چہرہ اسکے خیال میں آتا ہے۔ اور وہ دفتری فائیلیں ایک طرف پھینک کر ہجوم کا حصہ بن جاتا ہے۔ سائکلوں، موٹر سائکلوں پر دفتروں کو جاتے ہوئے لوگ، مزدور پیشہ، بابو، طالبعلم سب کے سب اسی ہجوم میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

شہر سے دور ایک جدید بستی کے ایر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں کچھ لوگ کافی اور سگار سے شغل کرتے ہوئے زوردار بحث میں مصروف ہیں۔ بحث ان کا من بھاتا شغل ہے۔

"تو۔۔۔ تو سب لوگ بالکل تیار ہیں۔۔۔۔"

"ہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے"

"ہیں۔۔۔مگر ابھی تو دور دور تک۔۔۔شاید ابھی نہیں۔۔۔"

"لیکن تم نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا نا۔۔۔"

"ہاں ہاں۔۔۔فکر کیوں کرتے ہو۔۔۔صورت حال کچھ بھی ہو انہیں ہمارا خیال بالکل نہیں آئے گا۔۔۔"

"ان کے اپنے مسئلے ہیں۔۔ٹاور والا ان میں کافی مقبول ہے اور اسے سونپی گئی ذمہ داری۔۔۔۔۔وہ ذمہ دار شخص ہے۔۔۔"

"پر میں سوچ رہا ہوں کہ وہ ابھی شہر کے وسط میں ہیں۔۔"

"جلدی نہ کرو۔۔۔جلدی کام بگاڑ دیتی ہے۔۔۔"

"پر موسم بہت مناسب ہے۔۔۔"

"بعض لوگ کہتے ہیں تم ہر موسم کو مناسب موسم کہتے ہو۔۔۔"

"شٹ اپ۔۔۔"

شہر کے وسط میں لوگوں کا ہجوم کئی بار بکھرتا اور کئی بار اکٹھا ہوتا ہے۔لوگ ایک جسم، ایک آواز ہیں۔کوئی لالچ، کوئی فریب، کوئی شک، کوئی شبہ اب ان کے قدم متزلزل نہیں کر سکتا۔وہ تبدیلی کا حصہ بننے کے لئے تیار ہیں۔

"ہم آدم کی اولاد ہیں"۔۔۔اس بات میں انکی ہر بات پوشیدہ ہے اور ان کا عزم عیاں ہے۔

ٹاور نما عمارت کی سب سے اوپر والی کھڑکی سے وہی شخص دوبارہ جھانکتا ہے۔اسکی نظریں اس طرف ہیں جدھر ہجوم کا رخ ہے۔وہ ایمپلی فائر لگے لاؤڈ سپیکر کا استعمال کرتا ہے۔ہجوم میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔لوگ پھر ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں لیکن اگلے ہی چوک میں پھر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔انکے چہروں پر اب ذرا پریشانی سی ہے۔انکو احساس ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک شخص۔۔۔جو ان کو لیڈ کر رہا تھا۔۔نظر نہیں آ رہا۔۔بندہ غائب ہونے کی اطلاع ڈرائنگ روم میں پہونچتی ہے۔

"صرف ایک بندہ۔۔۔۔"عقل مند حضرات اپنا من پسند شغل شروع کرتے ہیں

"میں نے کہا تھا کہ ابھی لوگ۔۔۔"

"رہنے دو تم۔۔۔میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ کچھ لوگ۔۔۔کچھ اور لوگ۔۔۔۔"

پر ہمارا انکا اختلاف اتنا زیادہ تو نہیں۔۔۔اصل میں ہم ایک ہی ہیں۔۔۔"

"بات اختلاف کی نہیں۔۔۔لوگ جان چکے ہیں۔۔۔وہ برسوں کے اندھیرے سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔۔۔"

"پھر اب۔۔۔"

"پھر انتظار کرو۔۔"

خاموشی۔۔۔۔کافی۔۔۔۔سگار

ہجوم اب ایک چوک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی جانب رواں ہے۔ٹاور نما عمارت سے یکے بعد دیگرے حکم جاری ہو رہے

ہیں اور بندے ایک ایک کر کے غائب ہو رہے ہیں۔ شہر کی سڑکیں ٹریفک سے خالی ہیں اور ہر طرف سرہی سر نظر آ رہے ہیں۔ چوراہوں سے نکلنے والی خبریں ڈرائنگ روم تک پہونچ رہی ہیں۔ شہر کے وسط میں لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے، کچھ لوگ ایک جگہ رک کر سوچ بچار کر رہے ہیں۔ یہ خبر بھی جدید بستی میں پہنچ چکی ہے اور بحث کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔

"ہاں تو ٹھیک ہو گیا۔۔۔ لوگوں کی تعداد اب بہت کم ہے۔۔۔"

ہوں۔۔۔ لیکن وہ گئے کدھر۔۔۔؟

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ سب امکان نظر میں رکھو۔۔۔"

"مگر ناور والے نے ان کو ہر بات اچھی طرح سمجھا دی تھی۔۔۔"

"جی جی میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔۔۔"

"تمہاری منصوبہ بندی ہی غلط تھی۔۔۔"

"نہیں میری منصوبہ بندی میں کوئی سقم نہیں۔۔۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا۔۔۔ ضرور تم سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔۔۔

"تم اپنا قصور مجھ پر تھوپ رہے ہو۔۔۔"

"ہوں۔۔۔ نہ کوئی غلطی ہے نہ قصور۔۔۔ اصل میں لوگوں کو شعور ہی نہیں۔۔۔"

"شعور۔۔۔؟ وہ ہر بات اچھی طرح سمجھتے ہیں۔۔۔ تم خود وہاں کیوں نہیں جاتے۔۔۔؟"

"یہ میرا منصب نہیں۔۔۔ میرا کام صرف ان کو ان کے مسائل کی پہچان کروانا ہے۔۔"

"پھر ٹھیک ہے۔۔۔ وہ واقعی نہیں جانتے کہ وہ کس کے کہنے پر اکٹھے ہوئے ہیں۔۔۔"

"شٹ اپ۔۔۔"

کچھ وقت اسی طرح کی طعن و تشنیع میں گزرتا ہے۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر زور سے دستک ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک اٹھ کر دروازے تک جاتا ہے اور دستک دینے والے کو تقریباً گھسیٹ کر اندر لے آتا ہے۔ آنے والا بری طرح تھک چکا ہے۔ تیز تیز سانس لیتے ہوئے وہ انہیں کچھ بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ ماحول میں ایک دم خاموشی چھا جاتی ہے۔ وہ سب سوچوں میں گم ہیں اور ان میں اب بحث کی ہمت بھی باقی نہیں ہے۔

باہر نما عمارت کی کھڑکی بند ہے۔ وہاں بھی مکمل خاموشی ہے۔ سڑکوں پر ٹریفک چلنا شروع ہو چکی ہے۔ لوگوں کا ہجوم شہر کے وسط سے نکل چکا ہے۔ وہ پہلے کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے خاموشی سے، بغیر کوئی بات کیے، بغیر کسی نعرے کے چلتے جا رہے ہیں۔ ان کے چہرے سرخ اور آنکھیں نفرت سے بھری ہیں۔۔۔ ان کا رخ جدید بستی کے ایرکنڈیشنڈ ڈرائنگ روم کی طرف ہے۔

☆.....☆☆☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

کرش انڈیا

وہ ہتھ ریڑھی دھکیلتا ہوا تیزی کے ساتھ فروٹ منڈی کی طرف جا رہا تھا۔

اُس کی زندگی کا سفر؟ ''منہ اندھیرے گھر سے نکلنا۔ ریڑھی دھکیلتے ہوئے فروٹ منڈی پہنچنا۔ مناسب مول تان سے پھل خریدنا۔ انہیں ریڑھی پر لاد کر شہر میں اپنے مخصوص اڈے پر پہنچنا۔ سارا دن پھل بیچنا اور رات کے کسی لمحے سارے دن کی بکری کی رقم اور کچھ بچہ کھچا پھل لیکر گھر پہنچنا۔ اپنے بچوں کے پاس۔ اور پھر دن کی بھوک مٹانا۔ جو کچھ بھی بچے پکا ہوا رکھ دیں۔ رات کو سکون کی نیند سو کر منہ اندھیرے اٹھنا اور پھر زندگی کے اسی سفر میں جُٹ جانا۔ اس کی زندگی کا یہ سفر مسلسل جاری تھا۔

ایک چھوٹا سا مکان تھا جو اُس کا اپنا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت اُس کے ابا کو کلیم میں پڑا تھا۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا تھا کہ اسے رہائش کی فکر نہیں تھی۔ وہ اپنی سادہ زندگی میں بہت خوش تھا۔ وہ مزدور تھا۔ محنت کار تھا اور محنت کے سامنے سب کچھ ہیچ سمجھتا تھا۔ اُسے یاد ہے وہ دن جب وہ چھوٹی سی رانو کو کندھے پر اُٹھا کر اپنے نئے وطن میں داخل ہوا تھا۔ ہندوستان کا بارڈر پار کر کے اپنے عزیز دیس پاکستان میں قدم رکھ چکا تھا۔ ایک مختصر سا کنبہ ماں، باپ، اچھو، رانو اور وہ خود۔ لاہور کے ایک کیمپ میں آن پڑے تھے۔ تھکے ماندے بھوکے پیاسے۔ کتنی ہمت تھی اماں ابا کی وہ ہمیں خطرات سے کھیل کر پاکستان لے آئے تھے۔ کھیتوں میں چھپتے چھپاتے، بلوائیوں سے بچتے بچاتے۔ آخر وہ ہمیں پاکستان لانے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے۔ خون کا سمندر تھا جو ہم نے پار کیا۔ اور مجھے یاد ہیں اب تک ابا کے وہ الفاظ جو انہوں نے کیمپ میں آتے ہی سب سے پہلے اماں سے کہے تھے ''دیکھئے پتہ نہیں کرم دین کا کیا بنا؟ وہ پاکستان پہنچ بھی سکے یا اس کی راہ میں شہید ہو جائے۔'' تو اماں نے کہا تھا ''اللہ ان کی حفاظت کرے گا'' اور پھر کچھ دنوں بعد فوجیوں کی ایک لاری کیمپ میں آ کر رکی۔ دھول میں اٹے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس زندہ لاشیں لاری سے جہاں اُتریں وہیں گر پڑیں۔ کیمپ کے لوگ جو قدرے سنبھل چکے تھے آ آ کر اپنوں کو ڈھونڈ رہے تھے اور اللہ کا شکر کہ چاچا کرم دین مل گیا۔ چھیمو کو اس نے اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ بہت ہمت والا تھا۔ تگڑے تو ابا بھی تھے مگر چاچا ابا سے چھوٹا تھا جوان اور تگڑا تھا۔ اُس نے سینہ تان کر ابا کو بتایا کہ ''ریشمیں وطن کی راہ میں شہید ہو گئی'' یہ خبر سن

کراماں کا برا حال ہوا۔ رو رو کر نڈھال ہوئی مگر ابا بھی کچھ کم مغموم نہیں ہوئے بس ڈھاہیں مار کر رونے ہی والے تھے کہ چچا نے ان کو سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے ابا سے کہا "ہمت کر بھائیا ہم دل ہار گئے تو بچوں کا کیا ہوگا؟" اور ان کی باتیں میں سن رہا تھا۔ ابا اور چچا کے بعد میں ہی سب سے بڑا تھا۔ میں نے وہ سب کچھ دیکھا جو راستے میں ہوا۔ میں نے وہ سب کچھ جھیلا تھا جو وطن کی راہ میں ہو گزرا تھا۔ میرا لڑکپن تھا۔ مگر اس دن میں نے اپنے آپ کو ابا اور چچا کے برابر جوان پایا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ کیمپ کے دفتر کا آدمی ایک عورت اور آدمی کو ہمارے پاس چھوڑ گیا۔ عورت تو اماں کے گلے لگ کر خوب روئی۔ شہید چچی کا نام لے لے کر بین کئے اور آخر جب بینوں کا دور تھما تو ہمیں معلوم ہوا کہ وہ عورت ہمارے دور کے رشتہ کی خالہ اور آدمی اس نسبت سے خالو ہے۔ انہوں نے ہم لوگوں کے نام کیمپ میں درج کروا رکھے تھے اور روز آ کر ہمارے بارے میں پوچھتے تھے۔ آخر ہم آج ان سے مل ہی گئے۔

دفتری کاروائی کے بعد وہ ہمیں اسی دن لیکر اپنے گھر چلے گئے۔ لاہور والے چچا کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے ہندوؤں کا ایک متروک مکان جو چچا کے محلے میں ہی تھا جلدی ہمیں مل گیا اور ہم اس میں جا بسے۔ تب سے اب تک کتنا سکون ملا کہ گھر میں چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں کی۔ اپنے چچازادوں کی شادیاں کیں۔ اب ان سب کا عبداللہ ہی ابا تھا۔ سب چھوٹے اس کو ابا کہتے اور چھوٹے بہن بھائیوں کی اولادیں دادا کہتیں۔ ابا اور دادا کے الفاظ اس کے کانوں کو کتنے بھلے لگتے۔ جب بچے اسے ابا اور دادا کہتے تو وہ اپنی تنہائی بھول جاتا۔ اس کو اس کا غم نہیں تھا کہ اس نے اپنے چھوٹے کی خاطر اپنا گھر نہیں بسایا۔ حالانکہ اسے چھوٹے بہن بھائیوں اور چچا کے بیٹے بیٹیوں نے بہت کہا مگر وہ یہ جواب دیتا کہ تم ہی تو میرے بچے ہو۔ تم ہی میرا خاندان ہو مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔

اگرچہ وہ اب بڑھاپے کی دہلیز پر تھا مگر اس نے بڑھاپے کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ وہ محنت کا جنا تھا۔ محنت مشقت ہی اس کی مائی باپ تھے اسی سوچ کے ذریعے اس نے چھوٹوں کو پڑھا لکھا کر ان کی تربیت کی۔ ان کو عملی زندگی میں پہنچایا اور اب اس کے آگے ایک بڑی منزل تھی۔ عظیم منزل وہ اپنی نوجوان نسل کو تعلیم کی معراج پر لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے تعلیم کو ہی اپنی دوسری نسل کے بچوں کی منزل ٹھہرایا۔ یہی بچے اُس کی زندگی کا سہارا بنیں۔ زندگی کی آسودگی اسے اپنی محنت اور خلوص نیت سے ملی تھی۔ وہ اکثر کہتا خدا کسی کی محنت کو رائگاں نہیں جانے دیتا۔ اور اس ضمن میں لازمی یہ مثال دیتا "محمد علی جناح کی محنت نے پاکستان کو جنم دیا، میرے عظیم وطن کو جنم دیا۔ میری محنت نے میرے خاندان کی خوشیوں اور میرے ذہن میں دائمی سکون کو جنم دیا"۔ وہ ہمیشہ سوچا کرتا۔

مگر آج وہ بے چین تھا۔ پریشان تھا۔ مضطرب تھا۔ گوجرانوالا سے اس کا چھوٹا بھائی اسلم چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ جہاں پر عبداللہ نے اسے ایف۔ اے تعلیم دلوا کر پرائیویٹ فیکٹری میں فورمین کی جاب پر لگوا دیا تھا۔ بہن رانو کو بھی اس نے میٹرک کروانے کے بعد اپنے چچا کے بیٹے سلیم کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ سلیم کو عبداللہ نے بی۔ اے تعلیم دلوائی تھی اور اسے بھی لاہور میں واپڈا کے دفتر میں کلرک لگوا دیا تھا۔ رانوں اور سلیم کے بچوں کو وہ خاص اپنی نگرانی میں لاہور کے اچھے تعلیمی داروں میں تعلیم دلوا رہا تھا۔ گویا کہ عبداللہ نے اپنے ارمانوں کو اپنے ابا اور دادا ہونے کے وجود میں ضم کر دیا تھا۔ وہ ہی خاندان کا بڑا تھا۔۔۔ اور چھوٹے بڑے بچوں کی تمام ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی

تھی۔ اچھو کی تنخواہ بھی کافی تھی اور چھیموں تو واپڈا میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ لگا ہوا تھا۔ اس کی ماہانہ آمدنی اچھے بھلے درمیانے طبقے کی آمدنی کے برابر نہیں تو کم بھی نہیں تھی۔ ایک بات خاص یہ تھی کہ دونوں بھائی ہر ماہ اپنی کمائی اپنے باپ کے حوالے کر دیتے۔ شروع شروع میں تو عبداللہ نے لینے سے انکار کیا مگر جب بیٹی بیٹوں اور پوتوں نے اصرار کیا تو مان گئے مگر پھر بھی انہوں نے دونوں بچوں کے نام پر الگ الگ اکاؤنٹ کھلوا دیئے اور ہر ماہ پیسہ بنک میں رکھ چھوڑتا۔ گھر کا سارا خرچہ وہ اپنی محنت کی کمائی سے کرتا۔ اور دونوں بیٹوں کا پیسہ وہ محفوظ رکھتا۔ اُن کی اولاد چھوٹے بچے بچیوں کے سکول کے اخراجات کے لئے ضرور تھوڑا بہت ان پیسوں سے لے لیتا۔ ورنہ اس کی ہتھ ریڑھی اتنی برکت والی تھی کہ اس نے عبداللہ اور اس کے خاندان کو کسی طرح بھی مالی طور پر کمزور نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنے گھریلو حالات سے مطمئن تھا اور صحیح طریقہ سے مطمئن۔ اپنے ہم معیاروں میں اس کی محنت، ایمانداری اور حب الوطنی مسلّم تھی۔ وہ جب بھی کسی بدبخت شخص کو یہ کہتے ہوئے سنتا ''اچھا پاکستان بنا بھئی! ہر طرف چوری ڈاکے پڑ رہے ہیں'' عبداللہ اس پر سیخ پا ہو جاتا ''کیا پاکستان آپ کو کہتا ہے کہ چوری کرو اور ڈاکے ڈالو''۔ وہ لڑنے کی حد تک اس پر چڑھائی کر دیتا۔ یہی اس کی ایک کمزوری تھی پاکستان کے خلاف وہ کسی کے منہ سے شکایت کے الفاظ سننے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

ملک بننے کے 18 سال بعد ہی 1965 میں جب ہندوستان نے حملہ کیا تو عبداللہ خود بھی اپنی بندوق لوڈ کر کے واہگہ کی طرف ہندوؤں کا راستہ روکنے کے لئے لاہور کے عوام کے ساتھ نکل کھڑا ہوا تھا۔ مگر ہندو سپاہی مارنے کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ جب پاک آرمی نے عوام کو لاہور کی طرف واپس چلے جانے کا کہا۔ وہ اپنے بچوں سے بھی کہا کرتا تھا ''بچو! ہماری جانیں پاکستان کی امانت ہیں۔ ہم نے خاک و خون کا سمندر پار کر کے یہ ملک حاصل کیا۔ ہم نے اپنی جانیں دیں۔ عزتیں لٹا کر اس پاکستان کو حاصل کیا تھا۔ تیار رہیں جب بھی ہمارے وطن کو ہماری جانوں کی ضرورت پڑے تو اس وطن کی آن پر قربان کر دیں گے۔

چونکہ اس نے تقسیم ہند کو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ظالموں کی برچھیوں پر مسلمانوں کے زندہ بچوں کو پرویا ہوا دیکھا تھا۔ عورتوں کی عزتوں کو لٹتے دیکھا تھا۔ تقسیم میں چھپی بڑی سے بڑی مصیبتوں کو اپنی جان پہ جھیلا تھا۔ لہذا اس کا وطن ہی اس کے لئے سب کچھ تھا۔ گذشتہ عرصے میں کتنی ہی لمبی راتیں تھیں جو اس نے اپنی آنکھوں میں بیقرار اور بے چین ہو کر گزاری تھیں۔ 1965 کی وہ رات جب اس نے سنا کہ انڈین جنرل نے اعلان کیا ہے کہ وہ اگلی صبح کا ناشتہ لاہور جمخانہ کلب میں پہنچ کر لنچ کرے گا۔ عبداللہ وہ ساری رات سو نہ سکا تھا۔ ساری رات امید و بیم کی حالت میں بے چینی اور بے قراری میں گزاری تھی اور پھر 1971 کی جنگ کی خبروں نے تو اسے چارپائی پہ ڈال دیا جب بھی محاذ سے پریشان کن خبریں آتیں تو وہ دوسروں کے سامنے چپ کر کے منہ چھپا لیتا اور آنسوؤں کا طوفان اس کی آنکھوں سے باہر نکلتا۔ ''کیا قائداعظم نے اسی مقصد کے لئے پاکستان بنایا تھا'' ابھی تو ملک کی زندگی چوبیس کی بھی نہیں ہوئی۔ ابھی تو ملک پوری طرح جوان بھی نہیں ہوا۔ پھر اس کی یہ حالت بنا دی گئی۔ ''ڈھاکہ چلا گیا'' ''قائداعظم کی محنت رائیگاں گئی۔ عزتوں اور جوانیوں کی قربانی کہاں گئی، وہ خاک و خون کے دریا جو ظالموں نے مسلمانوں کے لہو سے بہائے تھے۔ ان کا سیلاب ایک بار پھر ہمارے پیارے وطن کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

Scanned with CamScanner

''یا اللہ خیر! اس ملک کی خیر'' دعا کے یہ الفاظ اس کی زبان پر تب آئے جب ہندوستان نے مشرقی سیکٹر سے اپنی افواج مغربی پاکستان کی طرف منتقل کر دی تھیں۔ آج کی رات نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سوچوں کی تلخی اس کے جسم کے روئیں روئیں میں بھر چکی تھی۔ فجر کی اذان کے بعد اس نے آداب سحر خیزی کی مصروفیات سے فارغ ہو کر ہتھ ریڑھی کو بمشکل سیٹ کیا۔ آج اس کے ہاتھوں میں ریڑھی دھکیلنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ وہ آج کی چھٹی کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر سکا۔ حالات سے مجبور تھا۔ بچوں کے داخلے شروع تھے۔ فیس ادا کرنی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں اس نے کافی رقم جمع کر لی تھی۔ آج کی سیل کے بعد فیسوں کے پیسے پورے ہو جائیں گے اور پھر اسے بچوں کے اکاؤنٹ سے رقم نکلوانے کی ضرورت نہیں تھی۔

انہیں سوچوں میں گم وہ ریڑھی دھکیلتا ہوا تیزی سے فروٹ منڈی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کبھی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے واقعات کی تکلیف دہ صورتحال آ جاتی اور کبھی بچوں کی فیسوں کی ادائیگی کی فکر اور اپنے کنبے کے مستقبل کی فکر در آتی۔ انہیں سوچوں خیالوں میں اردگرد سے بے خبر ریڑھی دھکیلتے ہوئے وہ تیز قدموں کے ساتھ منڈی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کہ یک دم ایک دھماکہ ہوا اور اس کا جسم اچھل کر چند گز دور جا گرا اور ریڑھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے سامنے پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ چکرا گیا۔ مگر جلد ہی سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ریڑھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے سامنے بکھری ہوئی تھی اور ایک پوش کار پاپ میوزک کی تانے اڑاتی سامنے کی سڑک پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اس پر کیا گزری۔؟ بیان سے باہر ہے۔ وہ بھاگتی کار کو دیکھ کر اس کے منہ سے ایک موٹی سی گالی نکلی ''تیری ماں کا کرش انڈیا۔۔۔۔ ڈھاکہ تو چلا گیا۔

بھاگتی ہوئی گاڑی کے پیچھے لکھا تھا ''کرش انڈیا''۔

☆.....☆☆☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

تمغہ

ڈی آئی جی سمیت پولیس کے تمام افسران موجود تھے۔ لمبے چوڑے سُرخ قالینوں اور کُرسیوں پر لوگوں کی بڑی تعداد جمع تھی۔ اسٹیج پولیس کے شہدا کی تصویروں اور پھولوں سے سجا دیا گیا تھا۔ درجن بھر پولیس کے شہدا کے رنگین پوسٹر ہال کی پچھلی دیوار پر بھی چسپاں تھے تاکہ اسٹیج پر بیٹھنے والوں کی نظر اُن پر بھی پڑ سکے۔ اناؤنسر نے مختصر تمہید کے بعد ڈی آئی جی شمس الحسن کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ ڈی آئی جی اسپیکر پر آئے تو ہال میں مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔

حضرات،

آپ سب جانتے ہیں، پنجاب پولیس نے کس طرح اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے جرائم پر قابو پایا ہے۔ ہم اپنے ان جوانوں کو سلام پیش کرتے ہیں جو معاشرے کے ان بدمعاش اور ناسور افراد کا مقابلہ دلیری سے کرتے ہوئے اُن کو کیفر کردار تک پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ کی طرح آج ہمیں پھر اپنے ان دو جوانوں پر فخر ہے۔ جنہوں نے اپنی جانوں کو شدید خطرے میں ڈال کر انسانیت کے دشمنوں کا خاتمہ کیا ہے۔ ان میں ایک سب انسپیکٹر حمید سندھو صاحب ہیں جس کی کارکردگی پچھلے کئی سالوں سے پنجاب پولیس کو کامیابیوں سے ہمکنار کر رہی ہے اور دوسرے عابد بلال ہیں جس نے اس کے شانہ بشانہ کام کیا۔ میں ان دونوں کو اگلے اسٹیج پر ترقی دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر ڈی آئی جی صاحب ایک طرف ہو گئے اور اناونسر نے دوبارہ اسپیکر پر آ کر اعلان شروع کیا، حمید سندھو صاحب اسٹیج پر آ کر اپنا تمغہ وصول کریں۔ (حمید سندھو تالیوں کے شور میں پُراعتماد قدموں کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھتا ہے اور اپنا تمغہ وصول کرتا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب اُس کے کاندھے پر بیجز بھی لگاتا ہے)

Scanned with CamScanner

اب میرا نام پکارا جانا تھا جس کے تصور سے میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے اور ٹانگوں میں لرزا طاری تھا۔ مجھے ڈر تھا، اُٹھتے ہوئے گر نہ پڑوں۔ میری ساری توجہ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے پر تھی۔ ایک دفعہ خیال آیا، پیشاب کا بہانہ کر کے بھاگ جاؤں لیکن اب وقت بالکل نہیں تھا اور مجھے ہر حالت میں اسٹیج پر جا کر اپنا تمغہ وصول کرنا تھا۔ مگر تھوڑی دیر رُکیں، پہلے تمغے کا باعث بننے والے واقعے کا ذکر ہو جائے۔

میں بطور پولیس کمانڈو پچھلے تین سال سے اسی تھانے میں تھا۔ ہمیشہ سول وردی میں رہنے کی وجہ سے کم ہی لوگوں کو اس بات کا پتہ تھا کہ میں پولیس کا آدمی ہوں۔ شہر کے مشرق میں بیس کلومیٹر کے فاصلے پر دریا ہے اور یہ علاقہ ایسا ہے جہاں دریا جب اپنی جولانی پر آتا ہے تو دور تک پر پھیلا دیتا ہے جس کی وجہ سے ادھر اُدھر جنگلات سے بن چکے ہیں۔ یہ جنگلات اس لیے بھی زیادہ ہیں کہ باڈر قریب ہونے کی وجہ سے تمام علاقہ پاک رینجر کی حدود میں آتا ہے اور وہ درخت کاٹنے کی اجازت نہیں دیتی۔ دریا کے آس پاس ہزاروں کی تعداد میں زمیندار ہیں اور سب نے غنڈے پال رکھے ہیں۔ یہ غنڈے پورے علاقے میں مجرمانہ کاروائیاں کرنے کے بعد ان زمینداروں کے پاس پناہ لیتے ہیں۔ کسی زمیندار کو اپنے مخالف سے نپٹنا ہو تو اپنے غنڈے کے ذریعے ہی دو دو ہاتھ کرتا ہے۔ گویا غنڈوں کو پناہ دینا علاقے کے زمینداروں کی بقا کا مسئلہ ہے۔ میں کم و بیش ان سب زمینداروں اور اُن کے متعلقہ غنڈوں سے واقف تھا لیکن مجھے اپنی مرضی سے کاروائی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ویسے بھی میرا منصب محض ایک حوالدار کی حیثیت سے بڑوں کے کاموں میں دخل دینا یا تھانے کی پالیسی وضع کرنا نہیں تھا اور تھانے دار کو اُس کا ' ' و بہ حصہ وقت پر پہنچ جاتا۔ چنانچہ پولیس اپنا اثر رسوخ عموماً شہری حدود میں برقرار رکھتی۔ گویا پولیس، زمینداروں اور غنڈوں کے درمیان یہ ایک خموش معاہدہ تھا۔ البتہ گرجی مہر پچھلے دو سال سے اس معاہدے سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ علاقے کے زمینداروں، غنڈوں، پولیس اور عوام، سب کے لیے خطرہ بن رہا تھا۔ چنانچہ اُسے کوئی بھی پناہ دینے یا ہمدردی کے قابل نہ سمجھتا۔ میں نے اُسے پہلی دفعہ اڑھائی سال پہلے حاجی شمس خاں کے ڈیرے پر دیکھا۔ اُس وقت وہ ایسا خطرناک نہیں تھا۔ میں اپنے تھانیدار کے ساتھ وہاں کسی ملزم کے حوالے سے گیا تھا۔ کم و بیش ان علاقوں کے تمام تھانیداروں کا معمول ہے کہ وہ کسی قسم کی کاروائی کرنا چاہیں تو سیدھے اُن زمینداروں کے ہاں جاتے۔ اگر ملزم کو پولیس کے حوالے کرنا ناگزیر ہوتا تو وہ خود اُسے حوالے کر دیتے ورنہ ڈیرے پر ہی مک مکا کرا دیا جاتا۔ اُس دن سہ پہر کا وقت تھا اور موسم سخت روشنی کا تھا۔ حاجی شمس خاں وہاں موجود نہیں تھا۔ ڈیرے پر بہت سے لوگوں کے موجود ہونے کے باوجود مکمل سکوت طاری تھا۔ گرجی مہر ایک طرف سنجیدگی سے بیٹھا تھا۔ یہ ساڑھے پانچ فٹ قد میں بالکل کمزور سا شخص تھا۔ چھوٹی چھوٹی باریک سی مونچھیں، کاندھے اندر کو دھنسے ہوئے، چہرہ بے رونق لیکن گندمی اور بمشکل پچاس کلو وزن ہوگا۔ الغرض پہلی نظر دیکھنے سے کچھ بھی تاثر نہیں بنتا تھا۔ حاجی شمس کا گاؤں جلال کوٹ کے نام سے معروف تھا جہاں اُس کی تین ہزار ایکڑ زمین تھی اور گرجی مہر کو اُسی کے ہاں پناہ بھی ملی ہوئی تھی۔ وہیں ساتھ والی چارپائی پر ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا

Scanned with CamScanner

پینٹ شرٹ پہنے، نہایت متفکر انداز میں لیٹا آسمان کو گھور رہا تھا۔ مجھے خیال گزرا، لڑکا حاجی شمس خاں کا بھانجا یا بھتیجا ہے لیکن جیسا کہ پولیس والوں کی عادت ہے، تھانیدار نے اس پُر اسرار خموشی میں لڑکے کی موجودگی کی گرید شروع کر دی اور بالآخر بات کھل گئی۔ لڑکا گرجی مہر کا واقف تھا اور لاہور سے لڑکی بھگا کر لایا تھا۔ لڑکے کی شکل انتہائی معصوم تھی۔ نرم رخساروں پر ابھی سبزے کی آمد ہوئی تھی جسے دو چار دن پہلے ہی شیو کر کے صاف کیا گیا تھا کیونکہ سُرخ و سفید اور چکنے چہرے پر ہلکی ہلکی لویں دوبارہ نمودار ہو رہی تھیں جو اُس کے حسن کو مزید ابھار رہی تھیں۔ الغرض لڑکا خود بھی نرم و نازک، خوبصورت اور نسوانی حسن کے خدوخال رکھنے والا تھا۔ گرجی مہر سے خدا جانے اُس کا تعلق کیسے ہوا؟ مجھے اس تمام صورت حال سے خوف سا آنے لگا اور میں لڑکے کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گیا لیکن میں نے خود کو قابو میں رکھا اور لڑکے سے توجہ ہٹالی۔ بہر حال دو گھنٹے بیٹھے رہنے کے باوجود حاجی شمس گھر سے باہر نہ آیا اور نوکر کے ہاتھ پیغام بھیج دیا کہ دو دن کے بعد آجائیں تو معاملہ طے کر لیں گے یا مطلوبہ شخص کو تھانے حاضر کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ہم واپس آ گئے لیکن دوسرے ہی دن ہمیں خبر ملی کہ گرجی مہر حاجی شمس کو قتل کر کے فرار ہو چکا ہے۔ واردات کی خبر ملتے ہی ہم پورے تھانے کی پولیس لے کر وہاں پہنچے۔ لاش اور موقع واردات کا ملاحظہ کیا تو معاملہ کھل کر سامنے آ گیا۔ ہوا یہ کہ حاجی شمس نے لڑکی پر قبضہ جما لیا تھا اور اُسے لڑکے کے حوالے کرنے سے ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ حتیٰ کہ اُس نے گرجی مہر کی بھی نہ سنی اور لڑکی سے خود نکاح کرنے کا بندوبست کرنے لگا۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر گرجی مہر نے لڑکے کو ساتھ لے کر حملہ کر دیا اور حاجی شمس سمیت تین بندوں کو قتل اور آٹھ لوگوں کو زخمی کر کے اور لڑکی کو لے کر فرار ہو گئے۔ لڑکا موٹر سائیکل چلانے کا ماہر تھا اس لیے کسی کے ہاتھ نہ آ سکے اور خدا جانے کہاں نکل گئے۔ اس واردات کے بعد اگرچہ پولیس نے اُن کو پکڑنے کی کئی مخلصانہ کاروائیاں کیں لیکن وہ ہر دفعہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے اور مزید کاروائیاں کرنے لگے اور کھل کھیلنے لگے۔ رفتہ رفتہ حوصلے اتنے بڑھے کہ بھرے مجمعوں میں اندھا دھن کاروائی کر جاتے۔ ان ڈکیتیوں میں کئی لوگوں کو قتل اور زخمی کیا۔ انہوں نے اپنا اپنا کام اس طرح سنبھالا کہ لڑکے نے موٹر سائیکل چلانے کا فریضہ ادا کرنا شروع کر دیا اور گرجی نے ڈکیتی اور قتل کرنے کا کام۔ اس طرح دو سال گزر گئے اور وہ قابو میں نہ آ سکے۔

اُس دن میں پورے ایک مہینے کے بعد گھر جا رہا تھا۔ مَیں چار دن کی چھٹی لے کر سیدھا ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ ان علاقوں میں لوکل ریل چلتی ہے، جو رائیونڈ سے بڑی لائن سے الگ ہو کر قصور، چونیاں، منڈی ہیرا سنگھ، بصیر پور، حویلی لکھا، پاکپتن اور عارف والا سے ہوتی ہوئی وہاڑی اور پھر دوسرے چھوٹے چھوٹے شہروں سے گزر کر دوبارہ بڑی لائن پر چڑھ جاتی ہے۔ میرا گھر راجہ جنگ میں تھا جو رائیونڈ سے قصور جانے والے لائن پر ہے۔ ریل سے جانے کا ایک فائدہ تھا کہ یہاں سے بیٹھتا اور سیدھا گھر کے سامنے اُتر جاتا۔ یہ دن کے دو بجے کا وقت تھا اور ریل بھی آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا مگر میں یہ ایک گھنٹہ تھانے میں رہنے کی بجائے اسٹیشن ہی میں گزارنا چاہتا تھا۔ ابھی میں ریل کی پٹڑی پر چڑھا ہی تھا کہ لوگوں کی تڑتڑاہٹ کا خوفناک شور برپا ہوا اور ایک ہی دم ہنگامہ سا

پھیل گیا۔ شور سن کر میں ایک دم اچھلا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آواز حاجی صداقت کی آڑھت کی طرف سے آئی تھی جو شہر کے اُس واحد ریلوے پھاٹک کے ساتھ تھی جس کا وجود عین شہر کی مرکزی سڑک پر تھا۔ لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اُس وقت بالکل نہتا ہونے کی وجہ سے عملی کاروائی کرنے سے پرہیز کرنا ہی میرے لیے بہتر تھا۔ جب میں آڑھت کے پاس آیا تو دو لاشیں خون میں لت پت پڑی میرا منہ چڑا رہی تھیں۔ اس ڈکیتی میں نامراد نے کھلے بازار میں گولیوں کا ایسے مینہ برسایا کہ راہگیر چوتڑوں کے بل گر گر پڑے۔ کس کا کلیجہ تھا جو پیچھا کرتا۔ بازار کے اگلے ہی موڑ پر لطیف کپڑے والے کے منہ میں کلاشنکوف کی نال ڈال کر پورا تین کلو سیسہ غریب کے پیٹ میں داخل کر دیا اور پیسوں کا تھیلہ بیگ میں اُلٹ لیا۔ لوٹ سے فارغ ہو کر جیسے ہی یہ موٹر سائیکل پر بیٹھا لڑکے نے موٹر سائیکل ایسے اُڑایا، جیسے آنکھوں کے آگے سے چھلاوہ نکل گیا ہو۔ پل کی پل میں دونوں شہر بھر کو تلپٹ کر کے یہ جا وہ جا، ہوا کی طرح اُڑ گئے۔ مَیں یہ سارا معاملہ ریل کی پٹڑی کے دائیں جانب کھڑا دیکھتا رہا۔ یہ چھوٹا سا شہر تھا۔ پولیس کو وہاں پہنچنے میں وقت نہیں لگا۔ پل میں افراتفری مچ گئی اور پورا شہر واقعے کی جگہوں پر سمٹ گیا

۔میں چونکہ کافی دنوں بعد گھر جا رہا تھا اور اس ڈر سے کہ چھٹی کینسل نہ ہو جائے، فوراً نظریں بچا کر وہاں سے کھسکا اور اسٹیشن پر آ گیا اور جب ریل آئی تو فوراً بھاگ کر چڑھ گیا۔ لیکن میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی واقعے کی اطلاع پہنچ گئی اور ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ آپ کی چھٹی کینسل ہے، فوراً واپس پہنچو۔ مجھے اس حکم پر تکلیف تو بہت ہوئی مگر حکم حاکم۔ دوسرے ہی دن شام چار بجے کی ریل سے واپس ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔ پولیس اس نئی واردات سے ایسے حرکت میں آئی جیسے تلووں میں آگ لگی ہو۔ دوسری طرف گرجی مہر کے متعلق طرح طرح کی توہمات عوام میں مشہور ہونے لگیں ۔ کسی کے مطابق وہ سب کچھ پولیس کی اشیر واد سے کر رہا تھا۔ کوئی اُسے انڈیا کی رینجر کا ایجنٹ قرار دینے لگا جو کاروائی کرنے کے بعد باڈر پار کر جاتا۔ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا اور پولیس کے لیے ایک مستقل دردسر بن گیا۔ چنانچہ ایس ایس ؟ صاحب نے اعلان کروا دیے کہ مخبر کو دو لاکھ کا انعام ملے گا۔ ایگل فورس کے کئی دستے دو دو کی شکل میں ترتیب دے کر پورے علاقے کی مکمل ناکہ بندی کر دی گئی۔ میری ڈیوٹی سب انسپکٹر حمید سندھو کے ساتھ لگا دی گئی۔ حمید سندھو کو چھ سال پہلے ایلیٹ فورس میں بحیثیت کانسٹیبل شامل کیا گیا تھا۔ اس دوران اُس نے بیسیوں پولیس مقابلوں میں حصہ لیا اور درجنوں جرائم پیشہ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ دو دفعہ خود بھی گولی کا نشانہ بنا لیکن موت سے بچ نکلا۔ چھ فٹ قد اور جسامت کی سختی نے اُس کے اندر طاقت کا ایک احساس پیدا کر دیا تھا جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس نے صرف چھ ہی سال میں سب انسپکٹر کا عہدہ حاصل کر لیا۔ سندھو کا تعلق ساہیوال ڈویژن کی ایگل فورس سے تھا لیکن پچھلے دو سال سے اُس کی تعیناتی سرگودھا ڈویژن میں تھی۔ اب جب کہ گرجی مہر نے بصیر پور کے حالات اس قدر خراب کر دیے تو ایس ایس پی اوکاڑہ نے اُسے سرگودھا ضلع سے طلب کر لیا۔ سندھو کی اس روز افزوں ترقی پر نہ صرف مجھے بلکہ تمام سکواڈ کو پرلے درجے کا حسد اور کینہ تھا۔ لیکن ہم اپنی پچھلے دو سال کی ناکامی اور

خجالت کو کہاں لے جاتے، جس نے ہمیں شدید طریقے سے نہ کہ عملی طور پر بلکہ ذہنی شکست سے بھی دو چار کیا۔ اس لیے ہم سندھو کی اس عزت افزائی پر سوائے کڑھنے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے اور خدا سے سچے دل سے دعا گو تھے کہ سندھو بھی کسی طرح ناکامی سے دو چار ہو۔ بہر حال ایس ایس پی چیمہ صاحب نے اُس کی تعیناتی بصیر پور میں فوری طور پر کر کے ضروری ہدایات جاری کر دیں اور میری ڈیوٹی اُس کے ساتھ لگا دی۔ عملی کاروائی کے لیے ہمیں جو علاقہ دیا گیا وہ بصیر پور سے لے کر سہاگ نہر، پھر وہاں سے دریا کو پار کر کے چک محمد پورہ سے ہوتے ہوئے باڈر تک چلا جاتا تھا۔ یہاں جنگلوں اور ویرانیوں کا ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ جہاں نہ آسانی سے پولیس کی گاڑی جا سکتی ہے اور نہ دوسرے ذرائع ہی کام کرتے ہیں۔ اس لیے وہ پچھلے دو سال سے انہی علاقوں میں گھوم رہا تھا۔ میرا سابقہ ریکارڈ اس بات کا گواہ تھا کہ میں انتہائی متحمل مزاج اور سوچ سمجھ کر کاروائی کرنیکے ساتھ بہادر آدمی تھا۔ میرا خیال ہے، میرے بارے میں یہ بات اُس وقت بالکل صحیح ہے، جب میں اپنے سے کم درجے کے لوگوں کے ساتھ کام کر رہا ہوں جبکہ سندھو کے ساتھ کام کرنے سے میری حیثیت دب جانے کا پورا امکان تھا کیونکہ مَیں بہر حال اُس جیسا مضبوط اعصاب کا مالک نہیں تھا۔ ایس پی صاحب نے انفارمیشن آلات سے لے کر ہتھیاروں تک کا تمام ضروری سامان ایگل فورس کے دستوں کے حوالے کر کے گرجی کو پکڑنے کے لیے دو ماہ کا وقت مقرر کر دیا۔ بہر حال میں اور سندھو سول کپڑوں میں اپنے علاقے کی چھان بین اور غیر متوقع کاروائی کے لیے کام کرنے لگے۔

یہ پورا علاقہ چونکہ بیلے، جنگل، نہریں اور چراگاہوں پر مشتمل ہے، اس لیے یہاں گائیں اور بھینسوں کی اس قدر کثرت ہے۔ لہذا ہم نے بھینسوں کے بیوپاری کا بھیس بدل لیا اور نئی ۱۲۵ ہنڈا موٹر سائیکل پر جگہ جگہ کھوج مارنی شروع کر دی اور گرجی کے متعلق ہر قسم کی سُن گن لینے لگے۔ لباس کے لحاظ سے ہم مکمل دیہاتی اور بیوپاری نظر آتے تھے۔ مَیلے صافے، لنگی اور کُرتے پہنے، شیویں بڑھی ہوئی، ہاتھوں میں ڈنگوریاں پکڑی اور پاؤں میں مقامی موچی کے ہاتھوں تیار چمڑے کے جوتے۔ یوں پورا ڈیڑھ مہینہ ہم نے اس کام میں صرف کیا۔ اس دوران آٹھ بھینسیں بھی خرید کر آگے بیچ دیں۔ اس کام میں ہمیں واقعی اتنا منافع بھی ہو گیا کہ ایک دفعہ سندھو نے مجھ سے مذاق میں کہا، کیوں نہ نوکری چھوڑ کر یہی کام کر لیں۔ سچ یہ ہے کہ اس ڈیڑھ مہینے میں ہمارا منافع چار تنخواہوں کے برابر نکل آیا۔

بہر حال وقت سمٹتا گیا اور ہم غیر محسوس طریقے سے اُن کے نزدیک ہوتے گئے۔ ہمارے پاس جو نقشہ تھا اُس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ علاقہ امیر اتیجے کا سے آگے نہر کی جھال کو عبور کر کے دریا کے ساتھ ساتھ جنگلوں کا تھا جہاں نہ تو پولیس کی گاڑی جا سکتی تھی اور نہ آدم نہ آدم زاد۔ یہ تمام جگہ پانچ کلو میٹر مربع میں مکمل غیر آباد اور باڈر تک چلی گئی ہے۔ ہم نے تین چار جگہ یہاں اپنے مورچے بنا لیے اور مسلسل رات چھپتے رہے۔ چھوٹی گنیں، پسٹل اور خنجروں کے علاوہ لوہے کی نوکیلی اور بھاری سلاخیں بھی ہمارے پاس تھیں۔ ہمیں پتا چلا، گرجی کسی بھی جگہ دو راتیں مسلسل نہیں گزارتا۔ متواتر ٹھکانا تبدیل کرتا ہے لیکن مطلوبہ علاقے میں کسی بھی جگہ مہینے

میں ایک آدھ رات ضرور ٹھہرتا ہے۔اس لیے ہم نے اسی خطے کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا لیکن ہمارا اُس کا سامنا نہ ہو سکا۔بات یہ تھی کہ وہ واردات کرنے کے بعد کم از کم دو تین مہینے روپوش ہو جاتا اور بالکل سامنے نہ آتا۔لیکن ایک بات جو ہمارے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوئی، وہ یہ کہ اُسے ریڈیو پر بی بی سی کی خبریں سننے کا بہت شوق تھا اور لوگوں نے اُسے یہ کہتے سُنا، انشاء اللہ میرے قتل کی خبر بی بی سی پر چلے گی۔لہذا ہم نے ایس ایس پی صاحب سے ریڈیو ریڈار سسٹم حاصل کر لیا اور اردگرد کے پانچ کلومیٹر میں بی بی سی کی خبروں کے وقت ریڈیو کی لہریں کیچ کرنے لگے جس سے ہمیں اُس کی سمت اور فاصلے کا بھی پتا چلنے لگا۔اس میں ہمارے ایک مخبر کا بہت زیادہ عمل دخل تھا جسے ہم نے زبردستی مخبر بنالیا کیونکہ پچھلے دو مہینے کی محنت کے بعد اس بات کا پکا یقین ہو گیا کہ یہ شخص گرجی کا مخبر ہے اور اُسے علاقے کی صورت حال کے بارے میں مطلع کرتا ہے۔جب زمین صاف دیکھتا ہے تو نئی کاروائی کا سگنل دے دیتا ہے۔اس سلسلے میں بصیر پور کا ایک پی سی او والا بھی ملوث تھا جہاں سے یہ شخص گرجی کو فون کرتا۔ہم نے یہ سارا کام نہایت خفیہ رکھا حتیٰ کہ اپنے تھانے اور ایس ایس پی تک کو بھی بتانا مناسب نہ سمجھا۔ہم نے ان دونوں کو اغوا کر لیا اور اگلی کاروائی شروع کر دی۔اس معاملے میں اگرچہ میں ساتھ تھا لیکن مجھے اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ یہاں تک پہنچنے میں صرف اور صرف حمید سندھو کے دماغ کو دخل تھا لیکن اُس نے ہر قدم پر مجھے یہ باور کرایا کہ سب کچھ میری وجہ سے ٹھیک ہو رہا ہے اور میں اس کیس میں بہت اہم ثابت ہو رہا ہوں۔میں تسلیم کرتا ہوں، یہ چیز اُس وقت میری ذات کو اور بھی پست کر رہی تھی اور میں لاشعوری طور پر اُس سے اتنا مرعوب ہو گیا کہ اُس کے کسی بھی حکم کی نافرمانی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ان دو مہینوں میں حمید سندھو نے میری ذات کو گویا ہپناٹائز کر دیا۔

یہ سردیوں کی ایک ٹھنڈی دوپہر تھی۔دھند اتنی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ہم نے موٹر سائیکل چک لکھا کے قبرستان ہی میں رکھ دی کہ اُس کی آواز قرب و جوار میں دور تک جاتی۔سراج دین عرف سراجے نے ہمیں بتایا، گرجی صبح چار بجے شاہد کے ساتھ دُلے کی بھینی پر پہنچا ہے۔وہ ساری رات سفر میں رہا ہے اس لیے ابھی تک سویا ہوا ہے۔اگر ہم پیدل نہر کے ساتھ ساتھ جائیں تو ہمیں مشکل سے وہاں پہنچنے میں بیس منٹ لگیں گے۔چنانچہ ٹھیک دو بجے ہم گرجی کے سر پر پہنچ گئے۔وہ عک کے پودوں کے درمیان ایک پُرانی کوٹھڑی میں تھا جسے کسی زمانے میں کھوئے کی بھٹیاں چلانے والوں نے بنایا تھا لیکن چار پانچ سال پہلے جو سیلاب آیا اُس میں یہ جگہ دریا کی لپیٹ میں آنے سے بے آباد ہو گئی، تب سے کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔بھٹیاں تو بالکل ختم ہو گئیں لیکن یہ بے آباد کوٹھڑی پکی اینٹوں اور بلند جگہ پر ہونے کی وجہ سے بچ گئی تھی۔اس کے اردگرد کیکروں کے بے شمار درخت بھی تھے۔کوٹھڑی کا دروازہ اندر سے بند ہونے کی وجہ سے ہم اُنہیں دیکھ تو نہ سکے البتہ اُن کے موٹر سائیکل کے ٹائروں کے نشان واضح دکھائی دے رہے تھے۔اس کے علاوہ سانس لینے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔جب ہمیں ہر طرح سے یقین ہو گیا کہ وہ دونوں موٹر سائیکل سمیت اندر ہیں تو ہم ایکشن کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔اب ہمارے سامنے دو ہی راستے تھے کہ باہر رُک کر اُن کا انتظار کیا جائے یا فوری حملہ کر دیا جائے۔میری

Scanned with CamScanner

نہایت غیر اضطراری طور پر اپنی رائفل کی نال کیکر سے بندھے سراجے کی طرف کر کے فائر کھول دیا۔ اگرچہ وہ پل بھر میں ڈھیر ہو گیا لیکن میں نے بار بار اپنی میگزین گولیوں سے بھر کر اُس پر خالی کی ۔ گویا میں اپنی فطری بُزدلی کا حساب چکا رہا تھا۔ اس عمل کے کچھ ہی دیر بعد جس میں مجھے لڑکے کی کراہیں سنی بند ہو گئیں، حمید سندھو باہر آیا تو میں بھاگ کر کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ لڑکے کا جسم بالکل برہنہ اور قریباً زرد ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ننگے جسم پر بے شمار نیل پڑ گئے۔ نبض کی رفتار تیزی سے سست ہو رہی تھی۔ مَیں نے جلدی سے اُس کا پاجامہ اوپر کر کے اُسے کاندھوں پر اُٹھا لیا لیکن اب سب کچھ فضول تھا۔ جسم سے خون اتنا بہہ چکا تھا کہ اُس کے بچنے کی امید صفر تھی۔ شاید اس بات کو حمید سندھو نے بھی محسوس کر لیا تھا اس لیے اب اُس نے مجھ سے مزاحمت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

پولیس آئی تو ہر طرف سکون ہو چکا تھا۔ پولیس نے تینوں کی لاشیں وین میں رکھیں اور چل دی۔

میرے کان پولیس کے ترانوں سے گونجتے رہے اور میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ دو تین قدم چلنے کے بعد میری حالت میں اعتدال آ گیا۔ بالآخر مَیں نے بھی اپنا میڈل ترانوں اور نعروں کے شور میں وصول کر لیا۔

☆☆.....☆☆☆.....☆☆

Scanned with CamScanner

جان من کا قہقہہ

سید مشکور حسین یاد

واہ کیا تازہ چلن ہے جان من کا قہقہہ
موجۂ گنگ و چمن ہے جان من کا قہقہہ
اس کی رفعت دیکھئے اس کی طرح داری کے ساتھ
شعلۂ کوہ و دمن ہے جان من کا قہقہہ
جس طرف جاتے ہیں جان من کی ہے ساری بہار
انجمن در انجمن ہے جان من کا قہقہہ
روشنی ہی روشنی ہر سمت پھیلی جائے ہے
کیا شہابِ صبح تن ہے جان من کا قہقہہ
دیکھتے ہی جایئے اس کو بہار اندر بہار
غارتِ سرو و سمن ہے جان من کا قہقہہ
آپ کچھ کہنے لگے تھے اب ذرا فرمایئے
قاتلِ قوسِ سخن ہے جان من کا قہقہہ
ہے اسی انداز کا مشکور وہ یزداں صفت
جیسے رشکِ اہرمن ہے جان کا قہقہہ

اکثر یوں ہوتا ہے

میکسم تانک/منو بھائی

جب تم مجھے پکارو
اور میں فوراً جواب نہ دوں
تو مجھے کوسنا نہ کرو
اکثر یوں ہوتا ہے کہ میرے کندھوں پر
تھکے ہوئے پرندے آرام کر رہے ہوتے ہیں
میں ان کے آرام میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا
اکثر یوں ہوتا ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے
میرے مرحوم دوست آ بیٹھتے ہیں
اور میں ان سے باتیں کر رہا ہوتا ہوں
اکثر یوں ہوتا ہے کہ میرے ہونٹ سوکھ جاتے ہیں
گیت کی پیاس کی شدت سے
اور میں گنگ ہو جاتا ہوں
تمہارا نام بھی نہیں لے سکتا
اکثر
اس سے کیا فرق پڑتا ہے
کہ میرا سایہ یہاں پڑا ہے
اور میں خود اکثر بہت دور
ناروک کے چیل کے جنگلوں میں
سارا سارا دن اور ساری ساری رات
گھومتا رہتا ہوں
جہاں میرے تمام دکھ، میری ساری خوشیاں
خیالات اور یادیں آباد ہیں
جب تم مجھے پکارو
اور میں فوراً جواب نہ دوں
تو مجھے کوسنا نہ کرو

Scanned with CamScanner



اشفاق رشید
اشرف سلیم
اسرار زیدی
مہین بٹ
سلمان صدیق



سرفراز سید
ڈاکٹر اسلم رانا
قائم نقوی
اختر حسین جعفری
اشرف جاوید
احمد راہی
اظہر جاوید
مدثر قدیر

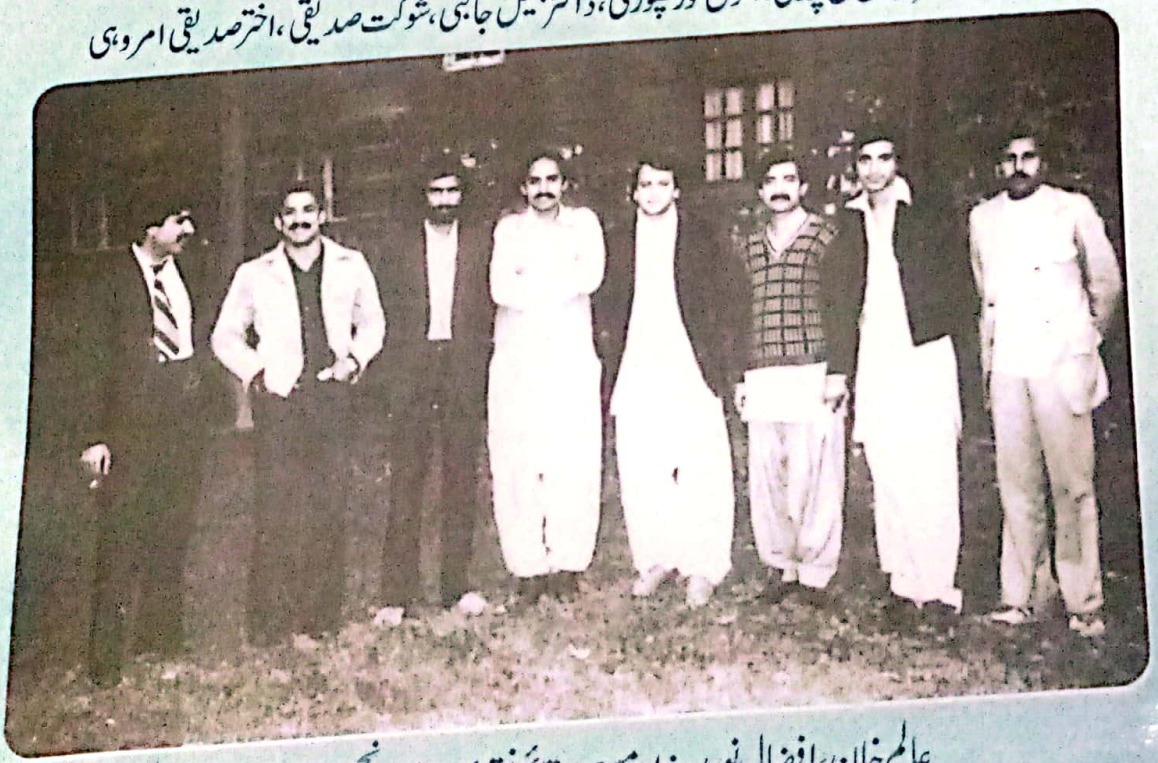


اے جی جوش
آشر محمود
سلمان صدیق
یونس ادیب
اشفاق رشید
ڈاکٹر اختر شمار

Scanned with CamScanner



سرشار صدیقی، انور شعور، ابن انشاء، خواجہ حمید الدین شاہد، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، محمد علی صدیقی، مشفق خواجہ
جون ایلیا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، شوکت صدیقی، اختر صدیقی امروہی



عالم خان، افضال نوید، زاہد مسعود، قائم نقوی، عباس نجمی، ناہید شاہد
مستعصم چوہدری، اعجاز کنور راجہ

Scanned with CamScanner